THE BOOK WAS DRENCHED

UNIVERSAL LIBRARY
OU_222146
UNIVERSAL LIBRARY

OUP 2272 19-11-79 10,000

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. Accession No.

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

وزیرِ اعظم

(ایک ناول)

عبدالرشید تبسمؔ

ناشر :

کتاب خانہ پنجاب لاہور

۲۶- بیرون لوہاری گیٹ

بار اول ۵۰۰ اپریل ۱۹۴۶ء قیمت ۴؍

فہرست مضامین

۱	جنگ کے بعد	۵
۲	میری زندگی	۶
۳	پہلا کچوکا	۱۱
۴	نئی دنیا	۱۹
۵	تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے	۳۸
۶	تیاری	۴۴
۷	پہلی ملاقات	۴۷
۸	ڈاکٹر ثریا	۵۹
۹	دوسری چوٹ	۶۲
۱۰	امید کا مرکز	۷۳

۱۱	مخلص دوست	۹۸
۱۲	عورت ذات	۱۰۵
۱۳	دیہات میں	۱۱۶
۱۴	ایک خط	۱۲۵
۱۵	میں اور اوشا	۱۳۴
۱۶	اُف ری دنیا	۱۴۲
۱۷	میرے دکھ کی دوا کرے کوئی	۱۶۳
۱۸	جیل میں خودکشی	۱۸۰
۱۹	نرس کا بیان	۱۹۰
۲۰	ایک ملاقاتی	۱۹۹
۲۱	قسمت کا فیصلہ	۲۱۶
۲۲	پروگرام	۲۲۵
۲۳	تین خط	۲۲۷
۲۴	انتخاب	۲۳۲
۲۵	آزمائش	۲۴۰
۲۶	تدبیر اور تقدیر	۲۵۰
۲۷	شیریں کی ضد	۲۶۴
۲۸	دو نہیں بلکہ تین لاشیں	۲۶۷
۲۹	ایک ہسپتال کا معائنہ	۲۷۱

جنگ کے بعد

اللہ اکبر! گزشتہ ایک سال میں دنیا کتنی بدل گئی۔ جنگ کا وہ مہیب طوفان جو ۱۹۳۹ء میں آندھی کی طرح اٹھا اور بادل کی طرح تمام دنیا پر چھا گیا۔ قیامت کی تیزی سے گزر گیا۔ بیشمار ماؤں کے جوان بیٹے توپ کے گولوں سے لڑ کر دادِ شجاعت دے گئے تھے۔ حکومت نے ان کی فہرستیں تیار کیں۔ لاکھوں نئی بیاہتا دلہنوں کا سہاگ میدانِ جنگ میں سنگینوں کے سامنے سینہ سپر ہو گیا تھا۔ اس کی یاد بیواؤں کے دل میں ہوک اور آنسوؤں کے نہ ٹوٹنے والے تار کی صورت میں باقی رہ گئی۔ اَن گنت بچے سسک سسک کر یتیمی کی گود میں سو گئے تھے۔ وہ کسی شمار و قطار میں نہ آئے۔ دنیا کو اپنی مصروفیتوں سے اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ معلوم کر سکے۔ ان یتیموں میں کتنے فخرِ روزگار مدبر کتنے آتش نوا شاعر اور کتنے طبیب تھے۔ جو زندہ رہتے تو وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ایک ایک کر کے زمانہ کی ساری بیماریاں بتا دیتے۔

میدانِ جنگ سے جو بہادر سپاہی زندہ واپس لوٹے تھے۔ انہوں نے اپنی بہادری کے کارنامے جوشیلے انداز سے بیان کئے کسی نے اپنی آنکھ پھوٹنے کی لرزا خیز داستان بیان کی کسی نے

بتایا کہ اس کا کان کس طرح گولی سے چھلنی ہوا۔ کسی نے اپنا کٹا ہوا بازو دکھا کر فخر سے وہ واقعہ سنایا۔ جب تلوار کی لڑائی میں اس کا ایک بازو کٹ گیا تو اس نے درد سے بے پروا ہو کر دوسرے ہاتھ سے جنگ جاری رکھی۔ اور دشمن کے پرے کے پرے صاف کر دیئے۔ اور کسی نے دوپہر کی گرمی میں سایہ دار درختوں کے نیچے آرام کرنے والے کسانوں کے روبرو زمین پر لکیریں کھینچ کر برلن اور روم کا محل وقوع واضح کیا۔

جنگ کے انجام پر تبصرے ہوئے۔ قرار پایا کہ فاتح قوم کو اس کے زبردست کیریکٹر کی وجہ سے فتح حاصل ہوئی۔ اور شکست خوردہ قوم کو اس کی بدنیتی کا صلہ مل گیا۔ دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ اور فاتح اور مفتوح قوم کے درمیان اخلاق کی حد فاصل قائم کر دی گئی۔

ہندوستان کے سپوت بھی لڑے اور خوب لڑے تھے انہوں نے جنگ کا رخ بدل دیا تھا اور آگے بڑھ کر فیصلہ کر دیا تھا کہ فاتح کون ہے۔ اور مفتوح کون۔ انگریز جرنیلوں نے تسلیم کیا۔ کہ ہندوستانی سپاہی میدان جنگ میں چٹان کی طرح اڑ جاتے تھے۔ ان جرنیلوں نے جنگ کے طویل عرصے میں ایک بھی ہندوستانی سپاہی کو بھاگتے یا پیٹھ پر زخم کھاتے نہیں دیکھا تھا۔ ہندوستانی سپاہی نے جو زخم کھایا سینے پر کھایا۔ دنیا نے مان لیا کہ زخم کھا کر شیر کی طرح زیادہ بپھر جانا صرف ہندوستانی سپاہی کا کیریکٹر تھا جس کی مثال کسی دوسرے ملک کا سپاہی پیش نہ کر سکا۔

ہندستانی سپاہی کی لاثانی بہادری کے صلہ میں، جنگ ختم ہونے پر ملک معظم کی حکومت نے ہندوستان کی آزادی ایک درجہ اور بڑھا دی۔ صوبوں کو پہلے سے زیادہ وسیع اختیارات دے کر ان کی اسمبلیوں میں ممبروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔ اور مرکزی اسمبلی کو تاج کی بجائے عوام کے سامنے جواب دہ قرار دے دیا۔ ملک معظم کے اس فیصلہ پر بعض ہندوستانی لیڈر مایوس ہو گئے۔ اور صاف کہہ دیا کہ ہم نے سوئی مانگی تھی ہمیں پتھر ملا۔ بعض لیڈروں نے خوشی ظاہر کی اور اس فیصلہ کو غنیمت سمجھا۔ لیڈر ایک دوسرے کے جواب میں بیان شائع کراتے رہے۔ مگر ملک کے طول و عرض میں نئے قانون کے مطابق انتخابات لڑنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جنگ کے اثرات وقتی طور پر اس شور و شغب کی رو میں بہہ گئے۔

میری زندگی

جنگ سے پہلے میں انسپکٹر جنرل شفاخانہ جات کے دفتر میں کلرک تھا۔ کئی سال کی مسلسل جنگ نے دنیا کا ہر شعبۂ حیات بدل دیا۔ نئے حالات کی روشنی میں نئے انتظام ہوئے۔ اور یوں معلوم ہونے لگا کہ یہ دنیا دراصل وہ دنیا نہیں جو جنگ سے پہلے تھی۔ ان تمام تبدیلیوں

کے باوجود میں اب بھی کلرک تھا۔ میرے حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور ہوتی بھی کیسے؟ کلرکی ایک ایسی صفت ہے۔ جس پر زمانہ کی سردی گرمی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میز پر کرم خوردہ فائلوں کے انبار۔ آنکھوں پر عینک۔ دوات قلم سے بے تکلفی۔" صاحب کے منہ لگے چپڑاسی سے خوشامدانہ ہنسی مذاق۔ افسر سے روزانہ جھاڑ کھانا اور اس جھاڑ کا روشن پہلو تلاش کر کے اسے یار دوستوں کے سامنے پیش کرنا تنخواہ کم اور بچے زیادہ۔ یہ کلرکی کے عام لوازمات ہیں۔ آج سے صدیوں پہلے انہیں صفات کا مجموعہ کلرکی کہلاتا تھا۔ آج بھی اس میں سرمو فرق نہیں آیا۔ اور جب تک یہ دنیا قائم ہے۔ اور اس میں ایک بھی کلرک باقی ہے۔ کلرکی کے یہی اجزائے ترکیبی رہیں گے۔ اسی دائرہ سے باہر کی باتوں سے کلرک کو نہ کبھی دلچسپی ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔ پھر اگر دنیا کے انقلاب کا اثر میری کلرکی پر نہ ہوا تو یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔

والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے پر مجھے اپنی تعلیم کو جلد ختم کر کے ملازم ہو جانا پڑا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے خاتمہ پر میری عمر بیس سال سے کم تھی۔ پھر بھی میں اپنے محکمہ کے تمام کلرکوں سے سینئر تھا۔ جس طرح ایک پیدائشی جرنیل تمام دنیا کو فتح کرنا اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ اسی طرح ایک پیدائشی کلرک ریٹائر ہونے سے پہلے ہیڈ کلرک بن جانا اپنی قسمت کا معراج خیال کرتا ہے۔ میں پیدائشی کلرک ہوں

یا نہیں ؟ یہ میں نہیں جانتا ۔ مگر ہیڈ کلرک بننے کی خواہش نے مجھے دیوانہ ضرور بنا دیا تھا ۔ میں صبح منہ اندھیرے دفتر میں آجاتا ۔ اور کافی رات گئے گہری تاریکی میں دفتر سے اٹھتا ۔ اور یوں اٹھتا کہ میری دونوں بغلوں میں فائلوں کے پلندے ہوتے ۔ جنہیں میں گھر جا کر پڑھتا اور ضروری باتیں اور سرکاری چٹھیوں کے حوالے نوٹ کر کے دوسرے دن کے لیے تیاری کرتا ۔ میری طبیعت میں یوں بھی نیازمندی زیادہ ہے ۔ اس نیازمندی کو کلرکی کی سان نے اور بھی تیز کر دیا ۔ رہی سہی کسر ہیڈ کلرکی کی خواہش نے نکال دی ۔ میں سپرنٹنڈنٹ کی آنکھ پہچانتا ۔ اور اپنا جواب " جی ہاں " " جی نہیں " تک محدود رکھتا ۔ دفتر میں مشہور تھا کہ میں سپرنٹنڈنٹ کے مزاج سے خوب واقف ہوں ۔ اگر وہ کسی دوسرے کلرک کے متعلق بری رائے کا اظہار کرتا ۔ تو میں اس کلرک کی برائی میں کئی باتیں بیان کر کے عرض کرتا ۔ کہ وہ صرف برا ہی نہیں بلکہ بہت برا ہے ۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ کو خوش کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ۔ مگر اس پر بھی ہیڈ کلرکی سے محروم رہا ۔ اور ایسا محروم رہا کہ تین دفعہ مجھ سے جونیئر کلرک ہیڈ کلرک بنا دیئے گئے اپنی اس محرومی کی ․․․ سینئر کلرک کو ہیڈ کلرک بنایا جائے ۔ جب میں سینئر ہوا ۔ تو محکمہ کی پالیسی بدل گئی ۔ اور فیصلہ ہوا کہ جس کلرک کا کام اچھا ہو ۔ صرف اسے ترقی دے کر ہیڈ کلرک کا عہدہ دیا جائے ۔ میرے کام میں کوئی نقص نہ تھا ۔ بات صرف یہ تھی کہ ہماری قابلیت کو سپرنٹنڈنٹ نہیں

جانچتا تھا۔ بلکہ اس کے دوست جانچتے تھے جس کلرک کی انہوں نے سفارش کردی۔ وہ ہیڈ کلرک ہو گیا۔ میں ان میں کسی کو نہ جانتا تھا۔ اس لئے کلرک کا کلرک ہی رہا۔

موجودہ ہیڈ کلرک صاحب شراب پینے کی وجہ سے خود ہی قبل از وقت پیٹائر ہونے والا تھا۔ اور ہیڈ کلرکی کی آسامی پھر خالی ہونے والی تھی۔ گزشتہ ناکامیوں نے میرے دل میں ناسور ڈال دیئے تھے۔ میں نے تہیہ کر لیا۔ کہ اب کے خواہ جان پر کھیلنا پڑے۔ میں اپنے آپ کو نظر انداز نہ ہونے دونگا۔ میں نے اپنے دوستوں سے کہہ دیا۔ کہ اس دفعہ میں ہیڈ کلرکی کا علانیہ امیدوار ہوں۔ اور وہ مجھے بہر حال صورت حاصل کرنی ہے۔ چوتھی مرتبہ نظر انداز کئے جانے کے خیال سے میرا خیال کھولنے لگتا۔ تنفس تیز ہو جاتا اور یوں محسوس ہوتا کہ آگ کے شعلے میری آنکھوں کو جھلس رہے ہیں۔

اب کے دفتر میں کوئی ایسا کلرک نہ تھا جس کی رسائی سپرنٹنڈنٹ کے دوستوں تک ہوتی نہ خود سپرنٹنڈنٹ کو ہی کسی سے خاص دلچسپی تھی۔ رہا اس کا اپنا بھتیجا۔ سو جمعہ جمعہ آٹھ دن اُسے دفتر میں آئے ہوئے تھے۔ وہ کلرکی کے آداب سے بھی ابھی آگاہ نہ تھا۔ ہیڈ کلرکی کے لئے تو بڑے شعور کی ضرورت تھی۔ اس لئے اس برخوردار کا امیدوار ہونا خارج از بحث تھا میرا خیال تھا۔ کہ اب کے سپرنٹنڈنٹ بھی مجھے ہی ہیڈ کلرک بناتا

پسند کرے گا۔ صرف وہ منت خوشامد چاہتا ہے۔ اس کی میں حد کر دونگا۔ سپرنٹنڈنٹ کے تیوروں سے میں نے اندازہ کیا۔ کہ اُسے کسی نہ کسی طرح معلوم ہو چکا ہے۔ کہ میں ہیڈ کلرکی کا علانیہ امیدوار ہوں۔ اس سے اور بھی ضروری ہو گیا۔ کہ اس سے دو ٹوک بات کر لی جائے۔ میں رات بھر اس مضمون کی تمہید سوچتا رہا جس پر صبح مجھے سپرنٹنڈنٹ سے گفتگو کرنی تھی۔

پہلا چوکا

صبح اٹھ کر میں نے بہترین لباس زیب تن کیا۔ اور کئی زاویوں سے اپنا سراپا دیکھا۔ باقی کلرکوں پر رعب رکھنے کے لئے ہیڈ کلرک کا خوش پوش ہونا ضروری ہے۔ مجھے یہ ثابت کرنا تھا کہ میں ہیڈ کلرکی کا اہل ہوں۔

لباس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے دفتر کی راہ لی۔ میں راستہ بھر خیالات میں کھویا ہوا تھا مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ دو ٹانگیں تھیں کہ مشین کی طرح چل رہی تھیں۔ اور میرے بے حس جسم کو اٹھائے اپنے مقررہ چکر گھوم رہی تھیں۔ یکایک چپڑاسی کے سلام نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا کہ میں دفتر میں

پہنچ چکا ہوں۔

ہم کلرکوں نے اچھے افسروں کی بعض علامات مقرر کر رکھی ہیں ان میں سب سے پہلی اور بڑی علامت یہ ہے کہ اچھا افسر جان بوجھ کر دفتر کے مقررہ وقت سے دس بیس منٹ لیٹ آتا ہے۔ تاکہ اگر کسی کلرک کو دیر ہو جائے۔ تو اسے افسر کے سامنے جوابدہ ہو کر شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ ہمارا سپرنٹنڈنٹ دفتر میں صبح جلد آنے کا عادی تھا۔ لیکن اس کی اس عادت کا تعلق اس کے اچھے یا بُرے ہونے سے نہ تھا۔ میں نے بارہا سنا تھا کہ بیوی سے اس کی بنتی نہیں۔ روزانہ بیوی کی جلی کٹی سننے پر وہ دفتر میں بیٹھ رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔

آج سپرنٹنڈنٹ خلافِ معمول دیر سے دفتر آیا۔ مجھے انتظار کی ایک ایک گھڑی سو سو سال کے برابر ہو رہی ہے۔ وہ آیا تو میں نے جلد از جلد اس مضمون کو اپنے ذہن میں دہرایا۔ جو رات کو سوچا تھا دو ایک گہرے سانس لیے۔ کالر ٹائی کو درست کیا۔ اور اٹھنے ہی کو تھا کہ سامنے سے چپڑاسی نمودار ہوا اور

"صاحب نے سلام دیا ہے۔" ٹکسالی فقرہ دہرا دیا۔

میں اٹھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سپرنٹنڈنٹ کے کمرہ کے قریب پہنچا۔ سانس کچھ اکھڑ گیا تھا۔ اس لیے ذرا توقف کیا۔ ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ اور زیر لب دعائیں مانگتا ہوا۔ اندر داخل ہوا۔ میں نے

جھک کر فرشی سلام کیا اور دفتری آداب کے مطابق خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ تاکہ کام کے متعلق وہ مجھے ہدایات دے چکیں تو میں اپنی رام کہانی شروع کروں۔ سپرنٹنڈنٹ نے اپنے موٹے چہرے پر چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو میری طرف گھمایا۔ اور فرنچ کٹ داڑھی کو ایک ہاتھ سے کھجاتے ہوئے کہا۔

"بشیر! تمہیں معلوم ہے کہ اسی شہر ریاض آباد میں ہم نے ایک زنانہ ہسپتال کھولا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر ثریا اس کی انچارج ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے۔ کہ وہاں ایک قابل تجربہ کار اور قابل اعتماد کلرک کی ضرورت ہے۔ تمہیں ٹائپ کرنا آتا ہے۔ دفتری کام میں ماہر ہو۔ پھر یہ کہ وہاں عورتوں کا معاملہ ہے۔ اور ہم تم پر پورا بھروسہ کر سکتے ہیں۔ ہم نے تمہیں وہاں تبدیل کر دیا ہے۔ سوائے تمہارے ہمارے پاس کوئی کلرک نہیں جو اس ذمہ داری کو سنبھال سکے۔ تمہیں وہاں بہت آرام رہے گا۔ کام زیادہ نہیں صرف ذمہ داری زیادہ ہے۔ تمہاری تبدیلی کے بارہ میں سیکرٹری بھی مجھ سے متفق ہے۔ میں ابھی ابھی اس سے مل کر آرہا ہوں۔ تم اب گھر جا سکتے ہو۔ کل ہسپتال میں حاضر ہو جاؤ۔"

سپرنٹنڈنٹ کے یہ الفاظ مجھ پر بجلی کی طرح گرے اور سر سے پاؤں تک مجھے جلا کر بھسم کر گئے۔ دل دھڑکا اور پوری شدت کے ساتھ دھڑکا۔ حلق خشک ہو گیا۔ زبان پر کانٹے اگ آئے۔

ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ سانس بے ترتیب ہوگیا۔ اور پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ میں نے بولنا چاہا لیکن نہ کھول سکا۔ حرکت کرنی چاہی جسم نے بغاوت کر دی۔ جو مضمون رات سوچا تھا۔ وہ تمام کا تمام بھول گیا۔ سوائے اس کے کوئی بات یاد نہ رہی کہ میں ہیڈ کلرکی کا امیدوار ہوں۔ اور تین مرتبہ پہلے ٹھکرایا جا چکا ہوں۔ ڈیڑھ دو منٹ کمرہ میں مکمل سکوت رہا۔ میں نے طاقت جمع کرنے کی کوشش کی۔ کامیاب نہ ہوا۔ اس ذہنی تعطل میں صرف اتنا کہہ سکا۔

"میں ہیڈ کلرکی کا امیدوار ہوں۔ آپ پہلے تین دفعہ میری ترقی روک چکے ہیں۔ اب مجھے ہیڈ کلرک بننے کا موقع دیجئے۔ دفتر میں اتنے کلرک موجود ہیں کسی اور کلرک کو ہسپتال میں تبدیل کر دیجئے۔"

سپرنٹنڈنٹ نے نہایت روکھے پن سے جواب دیا۔

"میں مجبور ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اب تمہاری ترقی کا دارومدار ڈاکٹر ثریا کی سفارش پر ہے۔ اگر انہوں نے تمہارے کام سے خوش ہو کر سفارش کر دی تو ممکن ہے کبھی تمہارے لئے ترقی کا موقع نکل آئے میں کہہ چکا ہوں زنانہ ہسپتال میں ہمیں قابل اعتبار آدمی کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر ثریا نئی نئی کالج پاس کر کے آئی ہیں۔ وہ دفتری کام سے قطعاً لاعلم ہیں۔ یوں بھی دفتر کی دیکھ بھال ان کا کام نہیں۔ ان کی اسسٹنٹ اور نرسیں سوائے اپنے پیشہ کے کچھ نہیں جانتی وہاں دفتر کا کام اور ریکارڈ کسی تجربہ کار کلرک کے سپرد ہونا چاہئے۔

اور اس کے لئے ہم نے تمہیں چنا ہے۔ یہ فیصلہ سیکرٹری کی مرضی سے ہوا ہے۔

اس عرصہ میں بتدریج میرے حواس قائم ہو رہے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ سپرنٹنڈنٹ اس مرتبہ بھی مجھے ہیڈ کلرکی سے محروم رکھنا چاہتا ہے میں اس وقت ہیڈ آفس میں ہوں۔ چیخ پکار کر سکتا ہوں ہسپتال میں چلے جانے پر مجھے سپرنٹنڈنٹ سے تحریری درخواست پیش کرنی ہوتی جو یقیناً کبھی منظور نہ ہوگی۔ ہیڈ کلرکی گئی۔ اس کے ساتھ ہی سپرنٹنڈنٹ سے دوبارہ ملنے کا موقعہ بھی گیا۔ کیوں نہ اسی وقت دل کی بھڑاس نکال لی جائے، کچھ اور فائدہ ہو نہ ہو۔ دل تو ہلکا ہو جائے گا۔ بولنے کے لئے منہ کھولا تو محسوس ہوا کہ اب میں بول سکتا ہوں۔ بلکہ محسوس ہوا کہ میرے سینے میں خیالات کے سینکڑوں بم بھرے ہیں۔ جو سب کے سب یک وقت پھٹ جانا چاہتے ہیں۔ ہر بم بجلی کی تیزی سے گلے کی طرف ابھر رہا ہے۔ اگر میں ان بموں کو ترتیب نہ دیتا اور سب کو یکبار گلے کی طرف اچھلنے دیتا تو وہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر میرے گلے میں پھٹ جاتے۔ میں بول نہ سکتا۔ لیکن ان کے پھٹنے کا مقام میرا گلا نہیں تھا۔ انہیں سپرنٹنڈنٹ کے کانوں سے ٹکرا کر پھٹنا چاہئے تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ذہن پر زور دیا۔ اور گلہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! آپ میرے افسر ہیں۔ میں آپ کو اپنا فیصلہ

بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتا ۔ میرے لئے دو ہی راستے ہیں۔ آپ کے حکم کی تعمیل کروں یا استعفا دیدوں ۔ میں غریب آدمی ہوں۔ میری گزر اوقات کے لئے ملازمت ضروری ہے۔ اس لئے میں استعفا نہیں دے سکتا۔ ناچار ہسپتال میں کام کرنا قبول کرتا ہوں ۔ مجھے اجازت دیجئے ۔ کہ میں آپ سے بطور افسر ماتحت کے نہیں ۔ بلکہ بطور ایک انسان کے دوسرے انسان سے گفتگو کروں ۔ میرا یہ جتانا فضول ہے۔ کہ میں نے دنیا کی تمام آسائشیں دفتری کام کی نذر کر دیں ۔ میرا اوڑھنا بچھونا دفتر کے فائل تھے ۔ میرا مذہب آپ کی خوشامد کرنا تھا ۔ میری زندگی کی تمام امیدیں سمٹ کر ہیڈ کلرکی کی خواہش میں آگئی تھی ۔ مگر آپ کی کھلی ہوئی بے انصافی نے مجھے تین دفعہ ٹھکرا دیا ۔ اور میرے دل کو پے در پے بجھا کے دیئے ہر دفعہ ٹھکرائے جانے کے بعد میں نے اپنی نیاز مندی میں اضافہ ۔ کام میں تیزی اور دفتر کے وقت کو پہلے سے لمبا کیا ۔ تاکہ کسی طرح آپ کا دل پسیج جائے ۔ آپ نے ہمیشہ میرے کام کی تعریف کی ۔ مگر ترقی دینے کے موقع پر ماضی کی باتیں ہمیشہ آپ کے ذہن سے مٹ جاتی رہیں ۔ ہر بات کی انتہا ہوتی ہے ۔ اب معاملہ میری حدِ برداشت سے گزر چکا ہے ۔ آپ کا مجھے چوتھی مرتبہ ترقی سے محروم کرنے کا یہ مطلب ہے کہ میں اب کبھی ہیڈ کلرک نہیں بن سکوں گا ۔ آپ بار بار زور دے رہے ہیں کہ زنانہ ہسپتال عورتوں کا معاملہ ہے ۔ وہاں کسی قابل اعتبار کلرک کی ضرورت ہے ۔ آپ

کو معلوم ہے کہ میں شادی شدہ نہیں ۔ شادی شدہ کلرکوں کو نظر انداز کر کے آپ عورتوں کا معاملہ ایک کنوارے نوجوان کے سپرد کر رہے ہیں ۔ یہ نرالی منطق ہے ۔ کیا آپ مجھے اس لئے تبدیل نہیں کر رہے ہیں کہ میں علیحدہ پڑا رہوں ۔ اور آپ کسی اور کو ہیڈ کلرک بنا دیں نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری ۔ جب میں یہاں موجود ہونگا نہ جھگڑا کھڑا ہوگا یاد رکھیئے ! خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ۔ اس کا صرف ایک دفعہ حرکت میں آنا ۔ آپ اور آپ کی اولاد کی ہڈی پسلی ایک کر دیگا ۔ جب خدا کسی کو عزت اور اختیار دیتا ہے ۔ تو اس کا حساب بھی پوچھتا ہے ۔"

سپرنٹنڈنٹ کا غصہ اور پیچ و تاب بتدریج بڑھ رہا تھا ۔ وہ اپنی ایک مونچھ دانتوں تلے دبائے بڑی تیزی سے چبا رہا تھا ۔ اس کے غصہ کا پیمانہ لبریز ہو گیا ۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور زور سے گھنٹی بجائی ۔ پھر چلا کر پکارا ۔

"چپڑاسی ! چپڑاسی !!"

میں نے کہا ۔

"میں آپ کا وہی پرانا نیاز مند بشیر ہوں مجھے کمرہ سے نکلوانے کے لئے چپڑاسی کی ضرورت نہیں ۔"

میں دروازہ کی طرف بڑھا ۔ پھر رک کر گھوما ۔ اور سپرنٹنڈنٹ سے مخاطب ہوا ۔

"آپ مجھے اجازت دیں کہ میں سیکرٹری سے مل کر اپنا معاملہ اس کے سامنے پیش کر سکوں۔ اس سے ملنے کے لئے آپ کی اجازت ضروری ہے۔"

سپرنٹنڈنٹ نے گرج کر کہا۔

"میں تمہاری درخواست کو رد کرتا ہوں۔ ایسی بیہودہ باتیں سننے کے لئے سیکرٹری کے پاس وقت نہیں۔"

جب آندھی چلتی ہے تو درختوں کی شاخیں ادھر اُدھر جھٹکے کھاتی ہیں۔ آندھی گزر جاتی ہے۔ مگر درختوں کی شاخیں دیر تک جھولتی رہتی ہیں۔ جذبات کی آندھی نے سپرنٹنڈنٹ کے کمرہ میں میرے دل اور دماغ کو بہت جھٹکے دیئے۔ جس وقت میں آ کر اپنی کرسی پر بیٹھا جذبات کی آندھی گزر چکی تھی۔ مگر میرے اعضا ابھی تک کانپ رہے تھے۔ میں اپنے آپ پر قابو پا چکا تھا لیکن ہیجان کے اثرات ابھی باقی تھے۔ مجھے سپرنٹنڈنٹ کے کمرہ سے غیر حالت میں نکلتے دیکھ کر دفتر کے تمام کلرک میرے گرد جمع ہو گئے۔ اور ہر طرف سے سوالوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔

میں نے بڑے تحمل اور ضبط سے ان کو بتایا کہ میرا تبادلہ نئے زنانہ ہسپتال میں ہو گیا ہے۔ بیک وقت تین چار کلرک چلا اٹھے۔

"تم تو ہیڈ کلرکی کے امیدوار تھے۔"

میں نے کہا۔

"ہیڈ کلرکی مجھے نہیں مل سکتی۔ اب میں سپرنٹنڈنٹ کی آسامی کا امیدوار ہوں۔ مجھے سپرنٹنڈنٹ بننا پڑے گا۔ ورنہ دفتر میں یونہی بے انصافیاں ہوتی رہیں گی۔"

میرے ایک دوست نے محبت آمیز ڈانٹ بتاتے ہوئے کہا۔

"کیا بکتے ہو۔ اگر سپرنٹنڈنٹ تک تمہاری یہ بڑ پہنچ گئی تو وہ سخت ناراض ہوگا۔ تم دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں رکھ سکتے۔ مجھے پتہ ہے کہ تم مذاق کر رہے ہو۔ جو کچھ تم کہتے ہو۔ تمہارا مطلب وہ نہیں ہے"

میں نے جواب دیا۔

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سو فیصدی سچ ہے۔ میں سپرنٹنڈنٹ ہوں گا۔ اور ضرور ہوں گا۔ کیسے؟ یہ میں نہیں جانتا۔ سپرنٹنڈنٹ گریجویٹ ہے۔ میں بھی گریجویٹ ہوں۔ وہ انگریزی میں چار سطریں لکھ سکتا ہے میں بھی لکھ سکتا ہوں۔ آخر اُس میں اور مجھ میں کیا فرق ہے؟"

اس پر کلرک بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگے۔

نئی دنیا

صوبہ کا دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے ریاض آباد بہت بڑا شہر ہے

میں نے یہیں بی اے پاس کیا اور یہیں بارہ چودہ سال ملازمت کی۔ ہر چند کہ گذشتہ کئی سال سے میری دنیا دفتر کے کمرہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ میں ریاض آباد کے چپہ چپہ سے واقف تھا۔ نیاز نانہ ہسپتال میری جائے رہائش سے تین ساڑھے تین میل کے فاصلے پر خان بہادر شمشیر علی بیرسٹر کی کوٹھی سے ذرا آگے تھا جن دنوں میں کالج میں پڑھتا تھا۔ کالج میں علمی مباحثے بہت ہوتے تھے۔ جہاں خان بہادر شمشیر علی تقریباً ہر مباحثہ کے صدر ہوتے تھے۔ وہاں کوئی مباحثہ اس وقت تک مباحثہ شمار نہ کیا جاتا تھا۔ جب تک میں اس میں حصہ نہ لوں۔ میں اور خان بہادر دو مختلف حیثیتوں سے علمی مجلسوں کے ضروری اجزا تھے۔ اس تعلق نے مختلف درجے طے کرتے ہوئے ہمیں دوست بنا دیا۔ ہماری موجودہ پوزیشنوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مگر خان بہادر نے مجھے کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ میرے اور ان کے درمیان پوزیشن کی دیوار حائل ہے۔ میں سال چھ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ان کے ہاں جاتا۔ مگر جب بھی جاتا۔ وہ کھل کر باغ باغ ہو جاتے۔ انہوں نے کئی دفعہ مجھے جتایا کہ مجھے کوئی بہتر نوکری تلاش کرنی چاہیئے۔ مجھے ہمیشہ یہی خیال رہا کہ قسمت اچھی ہو گی تو اسی محکمہ میں ہیڈ کلرک بن جاؤں گا۔ ہسپتال میں تبدیلی ہونے سے مجھے یہ تسلی ہو گئی کہ اب خان بہادر کی صحبت بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ان کی حضوری اکثر میسر رہے گی۔ کیونکہ ان کی کوٹھی ہسپتال کے بالکل قریب تھی۔

ہسپتال صبح سات بجے کھلتا تھا۔ میں پونے سات بجے وہاں پہنچ گیا۔ چند منٹ کے بعد ایک نرس آئی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس ہسپتال کا کلرک ہوں۔ اور لیڈی ڈاکٹر سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ اس ہسپتال میں دو لیڈی ڈاکٹر کام کرتی ہیں۔ اور ابھی آیا چاہتی ہیں۔

آدھ گھنٹہ بعد اسسٹنٹ لیڈی ڈاکٹر آئی۔ عمر چالیس سے اوپر۔ قد لمبا۔ آفتابی چہرہ۔ قدرتی طور پر نشہ سے چور آنکھیں۔ ذرا سانولا رنگ۔ لمبے بازو اور دہن غنچہ صفت۔ وہ ہلکے لہریا رنگ کی ساڑھی پہنے تھی نرس نے آہستہ سے اس کے کان میں کچھ کہا۔ وہ میری طرف آئی۔

"ہیلو کلرک! مزاج اچھا ہے؟"

یہ کہہ کر اس نے بڑی بے تکلفی سے ہاتھ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے ذرا خم ہو کر ہاتھ ملایا۔ اور عرض کی کہ میں حاضر ہو گیا ہوں۔ وہ کچھ کہنے کے لئے نرس سے مخاطب ہوئی ہی تھی کہ ایک اور خاتون نمودار ہوئی۔ یوں معلوم ہوا کہ بہشت زمین کی سیر کرتا خراماں خراماں چلا آرہا ہے۔ گلاب کے پھول سا رنگ۔ قد درمیانہ مگر طوالت کی طرف مائل۔ بھالے کی طرح دراز مژگاں۔ آہو چشم۔ بھرپور جوانی۔ عمر پچیس سے سرگوشیاں کرتی ہوئی۔ گہرے نیلے رنگ کی ساری میں ملبوس۔ اونچی ایڑی کا بوٹ پہنے ٹپ ٹپ کرتی سیدھی ہماری طرف آئی۔ اسسٹنٹ لیڈی ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا۔

"یہ ڈاکٹر ثریا ہیں"
میں جھک کر آداب بجا لایا۔ اسسٹنٹ لیڈی ڈاکٹر نے میرا تعارف کرایا۔ اس پر ڈاکٹر ثریا نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ مگر اس طرح کہ آنکھیں دوسری طرف اور انگلیوں میں قدرے ارتعاش جس خاتون نے لڑکوں کے کالج میں تعلیم حاصل کی ہو۔ اس کا ایک کلرک کے سامنے یوں چھوئی موئی بننا مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ ڈاکٹر ثریا نے میرے متعلق اسسٹنٹ لیڈی ڈاکٹر پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اسسٹنٹ لیڈی ڈاکٹر نے وہی سوال مجھ سے کئے۔ اور میں نے ہر بات کا جواب جچے تلے الفاظ میں دینے کی کوشش کی۔ آخر ڈاکٹر ثریا نے کہا۔
"کلرک سے کہو کہ اسے ہسپتال کا سرکاری کوارٹر رہنے کو دیا جائے گا۔ یہ اپنا سامان فوراً اس کوارٹر میں لے آئے۔ اور ہاں یہ بھی پوچھو کہ شادی شدہ ہے یا اکیلا؟"
اسسٹنٹ لیڈی ڈاکٹر نے وہی سوال مجھ سے کیا۔ سوال کا دوسرا حصہ سن کر یوں معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے مجھ پر بجلی گرا دی ہو۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میں دراصل کنوارہ ہوں۔ اب یہ ٹھہرا عورتوں کا ہسپتال اگر کہوں کہ کنوارہ ہوں۔ تو ممکن ہے۔ یہ کہہ دیں کنوارے آدمی کا یہاں ہسپتال میں رہنا ٹھیک نہیں۔ اس صورت میں مجھے واپس ہیڈ آفس جانا پڑے گا۔ میں وہاں سپرنٹنڈنٹ سے لڑ بھڑ کر آیا ہوں۔ وہ میری

جان کالاگھونٹ رہا ہے۔ چار دن میں مجھے ملازمت سے جواب دلا دے گا۔ اگر ان سے کہہ دوں۔ کہ شادی شدہ ہوں۔ تو یہ صریح جھوٹ ہو گا۔ اصلیت معلوم ہو جانے پر خدا جانے کیا کیا پیچیدگیاں پیدا ہوں میں سخت کشاکش میں تھا۔ ادھر دونوں لیڈی ڈاکٹروں کی توجہ میری طرف تھی۔ ڈاکٹر ثریا کی آنکھیں تو اب بھی ترچھے تیر برسا رہی تھیں۔ مگر اسسٹنٹ لیڈی ڈاکٹر کی بیباک نگاہیں میرے چہرہ پر گڑھی تھیں نا چار ہکلاتے ہوئے میں نے کہا۔

"اس بات کا فیصلہ میں آپ ہی پہ چھوڑتا ہوں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ مجھے شادی شدہ ہونا چاہئے۔ تو میں شادی شدہ ہوں تیری بیوی موجود ہے۔ بلکہ میں مسلمان ہوں۔ ایک چھوڑ میری دو بیویاں ہیں لیکن اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میرا کنوارہ ہونا برا نہیں۔ تو میں صحیح عرض کرتا ہوں کہ میں نے کبھی شادی نہیں کی اور نہ میری اولاد شادی کرے گی۔"

میرا یہ جواب سن کر دونوں کو اتنی ہنسی آئی کہ وہ بے اختیار دوہری ہوئی جا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نسیم سحر کے تیز جھونکوں سے دو سرو جھوم رہے ہیں۔ بالخصوص ڈاکٹر ثریا کی یہ حالت تھی کہ وہ اپنے افسرانہ وقار کو بکسر بھلا کر ہتھیلیوں پہ ہاتھ رکھے متواتر ہنسے جا رہی تھی۔ جب ان کی ہنسی کم ہوئی تو ڈاکٹر ثریا نے پہلی دفعہ مجھ سے براہ راست مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہیں آج باقی دفتر کی چھٹی ہے۔ تم جا کر آرام کر سکتے ہو۔ کل سے باقاعدہ حاضر رہنا۔ آج جانے سے قبل اپنا کوارٹر دیکھ جاؤ۔ جب چاہو اپنا سامان اس میں لے آؤ۔"

یہ کہہ کر انہوں نے اسی نرس کو میرے ہمراہ کر دیا۔ کہ وہ مجھے میرا کوارٹر دکھا دے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کہ میرا کنوارہ ہونا میری ملازمت کے راستہ میں روک نہیں بنا۔

کوارٹر مجھے پسند آ گیا۔ برآمدہ۔ برامدہ کے ایک سرے پر غسلخانہ اور دوسرے سرے پر کچن۔ برامدہ کے پیچھے ایک مستطیل کمرہ۔ اور پیچھے دو چھوٹے کمرے۔ کھڑکیاں اور روشندان اتنے تھے کہ خیال ہوتا تھا شاید اینٹیں بچانے کی غرض سے لکڑی کثرت سے استعمال کی گئی ہے۔ کوارٹر میں فرنیچر بھی موجود تھا۔ ایک میز۔ دو کرسیاں اور ایک چارپائی۔ حقیقت یہ ہے کہ کوارٹر میری ضروریات سے کہیں زیادہ تھا۔ کوارٹر کے سامنے گھاس کا ایک بہت بڑا پلاٹ تھا جس نے کوارٹر کو اور بھی دلپسند بنا دیا تھا۔

میں نے کوٹ اتار کر چارپائی پر رکھا۔ اور خود ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نرس بھی اسی احاطہ میں رہتی تھی۔ اس سے میں نے کہا۔ اگر کہیں سے اخبار مل جائے تو ذرا دل بہل جائے گا۔ نرس نے کہیں سے مانگ کر مجھے اخبار لا دیا۔ اور میں اسے پڑھنے لگا۔

ایک کلرک کی زندگی میں یہ کتنا بڑا انقلاب ہے کہ اس کے

دل میں اخبار پڑھنے کی خواہش پیدا ہوئی ہیں نے اندازہ کیا کہ میری طبیعت میں یہ انقلاب میرے روشن مستقبل کی دلیل ہے ۔ قدرت کی طرف سے یہ اشارہ ہے کہ میں کلرک ہونے کے علاوہ بھی کچھ ہوں ۔ ممکن ہے سپرنٹنڈنٹ بن جانا ہی میرے مقدر میں ہو ۔

میں نے سارا اخبار پڑھ ڈالا ۔ لیڈر ۔ نوٹ ۔ کتب پر تبصرے اشتہارات سب میری نظر سے گزر گئے ۔ جنگ ختم ہوئے سال بھر ہو چکا تھا ۔ اسمبلی کے انتخابات ابھی دور تھے ۔ ملک میں امن و امان تھا نہ کوئی وبا پھوٹی تھی نہ زلزلہ آیا ۔ اور نہ چوری اور ڈاکہ کی وارداتیں ہو رہی تھیں ۔ اخبار میں دلچسپی کیا ہوتی ۔ اگر تھوڑی سی بات بھی ہو ۔ تو اخبار نویس اسے بتنگڑ بنا کر اخبار کو دلچسپ بنا لیتے ہیں لیکن جب سرے سے کوئی بات نہ ہو تو بتنگڑ بھی کیسے بنے ۔ ایک دفعہ اخبار پڑھ چکنے کے بعد میں نے پھر اس کی سرخیوں پر نظر دوڑائی ۔ ایک سرخی میں کچھ جاذبیت نظر آئی ۔ لکھا تھا ۔

"ایک دیوی نوجوانوں کو منظم کرنے کے لئے میدان عمل میں"

نیشنل ہال میں ایک ولولہ انگیز لیکچر

ریاض آباد ۱۲ ر اپریل ۔ آج شام کے سات بجے رائے بہادر بہاری لال کی صاحبزادی اوشا دیوی نیشنل ہال میں صوبہ کے نوجوانوں کو ایک خاص پیغام دیں گی ۔ واضح رہے کہ اوشا دیوی نے صوبہ کے نوجوان مردوں اور عورتوں کی ایک مشترکہ انجمن قائم کی ہے ۔ جس کا

مقصد صوبہ کے ہر شعبۂ حیات سے نا انصافیوں کو دور کرانا۔ اور نوجوانوں
میں بیداری پیدا کرنا ہے۔ ہزاروں مرد اور عورتیں اس انجمن کی ممبر بن
چکی ہیں اور ابھی داخلہ جاری ہے۔

یہ خبر پڑھ کر میں نے سوچا کہ میں چار مرتبہ بے انصافی کا شکار
ہو چکا ہوں۔ ہمارے محکمہ کے دوسرے کلرکوں سے بھی سپرنٹنڈنٹ آئے
دن بے انصافی کرتا رہتا ہے۔ انجمن بے انصافیوں کو دور کرانے کیلئے
بنی ہے۔ دیکھنا چاہئے یہ کیسی انجمن ہے۔ ممکن ہے ہماری مدد کر سکے
میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ آج شام کو اوشا دیوی کا لیکچر ضرور
سنوں گا۔

گرمی کے موسم میں ایک تھکا ماندہ آدمی ذرا سستانے کے لئے کسی
درخت کے نیچے بیٹھ جائے۔ اور کہیں سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے
لگیں۔ تو اسے ضرور نیند آجائے گی۔ سپرنٹنڈنٹ سے کل جو بکبک
ہوئی۔ اس نے میری طبیعت کو سخت تھکا دیا تھا۔ آج لیڈی ڈاکٹروں
کا ہمدردانہ رویہ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ثابت ہوا۔ اگرچہ میں نے دوپہر
کا کھانا ابھی نہیں کھایا تھا۔ دماغ کو سکون ہونے کی وجہ سے اخبار
پڑھتے پڑھتے نیند آگئی۔ اور چارپائی پر خوب گہری نیند سویا۔ آنکھ
کھلی تو شام کے پانچ بج چکے تھے۔ بھوک لگ رہی تھی۔ کوٹ پہنا چلنے کو
تیار ہوا۔ مگر دیر رہا۔ صبح آتے وقت میں نوکر سے کہہ آیا تھا کہ آج پتہ
نہیں کس وقت دفتر سے لوٹوں۔ وہ صرف شام کا کھانا تیار کرے

اب ارادہ ہوا کہ کسی قہوہ خانہ میں بیٹھ کر چائے پی جائے۔ اس کے بعد اِدھر اُدھر گھوموں۔ پھر ارشاد بیگ کا بنگلہ تلاش کر کے پہنچ جاؤں۔

اتنے میں ایک آدمی میرے کوارٹر میں وارد ہوا۔

"السلام علیکم" کہہ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے ایک نظر سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ درمیانہ قد۔ موٹاپے کی وجہ سے جسم تقریباً مربع۔ تنگ پیشانی۔ چھوٹی آنکھیں۔ داڑھی صفاچٹ۔ مونچھوں کو تاؤ دیا ہوا۔ چہرہ پر چیچک کے داغ۔ رنگ گورا۔ زعفرانی رنگ کا سوٹ زیب تن۔ میں نے استفہامیہ نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی جس میں مجھے شرارت کی جھلک دکھائی دی۔ جب کوئی آدمی مجھ سے پہلی مرتبہ ملے۔ ایک ہی نظر میں اس کے متعلق میرے دل میں غیر شعوری طور پر ایک رائے قائم ہو جاتی ہے۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ میری ایسی رائے آخر کار صحیح ہی ثابت ہوتی ہے۔ میں اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے یہ تجربہ ایک دو مرتبہ نہیں بیسیوں مرتبہ ہوا ہے۔

نووارد نے گفتگو کی ابتدا کرتے ہوئے کہا۔

"میرا نام اشرف خان ہے۔ میں [illegible] کا کمیشن ایجنٹ ہوں۔ دیر سے آپ کی زیارت کا شوق تھا۔ آج اِدھر سے گزر رہا تھا کہ معلوم ہوا۔ آپ تبدیل ہو کر یہاں آ گئے ہیں۔ میں اسے خداساز بات سمجھ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ میں نے آپ کا قیمتی وقت تو ضائع نہیں کیا؟"

میں نے رسماً جواب دیا۔

"مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ لیکن میں ایک کلرک ہوں۔ کلرک کو ہر روز کام کے ایک ہی چکر میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ کلرک اور مشین میں کوئی فرق نہیں۔ مشین کلرک ہے اور کلرک مشین۔ میں غریب آدمی ہوں۔ آپ کیلئے کیسے مفید ہو سکتا ہوں۔ میں اپنی ساری جائداد بیچ کر بھی موٹر کار کی قیمت مہیا نہیں کر سکتا۔ اور سچ پوچھو تو ایک مشین کو دوسری مشین خریدنے کی ضرورت بھی نہیں"

وہ ہنس کر بولا۔

"آپ سمجھے نہیں۔ میں آپ کے پاس کاروبار کی غرض سے نہیں آیا۔ صرف ایک دوست کے طور پر آیا ہوں۔ میں صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟ اس علاقہ میں میری دو تین آسامیاں رہتی ہیں۔ میں اکثر ادھر آتا رہتا ہوں۔ مجھے یہاں سب لوگ جانتے ہیں۔ آپ کو کسی قسم کی تکلیف ہو تو مجھے فوراً کہئے۔ میرا مکان یہاں سے دور ہے۔ پھر بھی میں آپ کو اپنا ہمسایہ ہی سمجھتا ہوں۔ آدمی کا اصل مکان وہی ہے۔ جہاں اس کا کاروبار ہو"

اشرف کے اس بیان سے میری تسلی نہ ہوئی۔ محض اس سے پیچھا چھڑانے کی خاطر میں نے کہا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ! اگر کبھی ضرورت ہوئی تو میں آپ سے ضرور عرض کرونگا"

یہ کہہ کر میں نے اپنے پاؤں کو خفیف سی حرکت دی اور دروازہ کی طرف دیکھا۔ مطلب یہ تھا کہ اشرف سمجھ جائے ملاقات ختم ہے اور میں باہر جا رہا ہوں۔ اشرف نے میرا ارادہ بھانپتے ہوئے کہا۔

"آپ تشریف لے جا رہے ہیں؟ چلئے تھوڑی دور میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ کرافرد کمیشن ایجنٹ کی زندگی بڑی مصروف زندگی ہے۔ یہ محض اتفاق کی بات ہے۔ کہ آج شام مجھے فرصت ہے۔"

مجھے خیال آیا کہ مجھے ادشا کا لیکچر سننے کے لئے نیشنل ہال جانا ہے ممکن ہے وہاں میرا کوئی واقف نہ ہو۔ اگر اشرف میرے ہمراہ چلے تو رفاقت میسر آجائے گی۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے کہا۔

"فرصت مجھے بھی نہیں ہوتی۔ حسن اتفاق ہی ہے۔ کہ اس وقت دفتر سے باہر کھلی ہوائیں پھر رہا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کسی قہوہ خانہ سے چائے پی کر نیشنل ہال کا رخ کروں۔ وہاں آج ایک دلچسپ لیکچر ہے۔"

اشرف نے میرے ساتھ چلنے پر آمادگی ظاہر کی۔ میں نے قبول کر لیا۔

ہم نے چائے پی اور باتیں کرتے نیشنل ہال کی طرف روانہ ہوئے۔ باتیں ہو رہی تھیں اور ہر موضوع پر ہو رہی تھیں۔ اشرف باتیں

کر رہا تھا۔ اور میں بھی دخل دیئے جا رہا تھا۔ مگر میرا دماغ اسی ٹوہ میں رہا۔ کہ آخر وہ کونسی بات ہے۔ جو اشرف کو میرے پاس لے آئی۔ عالمگیر شہرت رکھنے والی کرافرڈ موٹر کمپنی کے ایجنٹ اور ایک معمولی کلرک میں کونسی بات مشترک ہو سکتی ہے؟ آخر اشرف مجھ میں کیوں دلچسپی لے رہا ہے؟ میں ایک کلرک ہوں۔ دوسرے اور بھی ہزاروں کلرک ہیں۔ وہ میرے پاس کیوں آیا؟ دوسرے کلرکوں کے پاس کیوں نہیں گیا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اشرف کو ایک نظر سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ اس میں مجھے کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ انسان کتنا شبہ باز ہے۔ کوارٹر میں اشرف کے داخل ہونے پر مجھے یوں معلوم ہوا تھا۔ کہ اس کے ہونٹ اپنی مسکراہٹ میں شرارت چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ بھلا مجھ سے کیا شرارت کر سکتا ہے۔ ایسے مصروف آدمی کو اتنی فرصت ہی کیسے ہو سکتی ہے۔ کہ کلرکوں سے شرارتیں کرتا پھرے۔

میں خیالات کی اس ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ نیشنل ہال آ گیا۔ اوشا دیوی کا لیکچر شروع ہو چکا تھا۔ ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ ہم سب سے پیچھے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ مجمع پر موت کا سا سکوت طاری تھا۔ اوشا دیوی کی آواز ہم تک صاف پہنچ رہی تھی۔

اوشا کہہ رہی تھی۔

"میں نہیں کہتی تم بغاوت کرو یا حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش

کرو۔ اور ملک کے قانون کا احترام اٹھادو۔ میں نہیں کہتی تم کسی ضابطہ کی
پابندی نہ کرو۔ میں تمہیں کہتی تم سول نافرمانی کرکے جیلوں کو بھر دو۔ میں تخریبی
کام میں حصہ لینے کی تلقین نہیں کرتی مگر میں آج اس سٹیج پر سے اعلان کرتی
ہوں کہ جو بے انصافیاں اس وقت حکومت کے ہر محکمہ میں ہو رہی ہیں۔
ان کو ختم کرنا ہمارا پہلا فرض ہے۔ میں انسانیت اور انصاف کے نام پر
تم سے اپیل کرتی ہوں کہ اٹھو اور ظلم کرنے والے ہاتھ کو کاٹ کر رکھ دو
مجبور اور بے بس انسانوں کے خلاف منصوبے سوچنے والے سازشی اور
کمینہ لوگوں کے دماغ ماؤف کر دو۔ رشوت کا بازار گرم ہے۔ اس بازار
کو صرف بند ہی نہیں کرنا۔ بلکہ اسے بارود سے اڑاتا ہے تاکہ اس کا نشان
تک باقی نہ رہے۔ شہری آبادی پر آئے دن ٹیکس بڑھ رہے ہیں۔ ان کا
انسداد کرو۔ میں نے بعض دیہات کے حالات معلوم کئے ہیں۔ وہ حد
درجہ مایوس کن ہیں۔ کسان سو من غلہ پیدا کرنے کے بعد بمشکل تین من
اپنے گھر لے جاتا ہے۔ باقی غلہ لگان اور دوسرے مصارف میں اڑ جاتا
ہے۔ میں کہتی ہوں اسے فاقوں سے نجات دینا ہمارا فرض نہیں؟ اس
کے گاڑھے پسینے کی کمائی کیوں نہ پوری کی پوری اس کے گھر پہنچے۔
یاد رکھو! تمہارے صوبے کو بہت بڑے انقلاب کی ضرورت ہے۔ یہ جہنم بنا
ہے۔ اسے بہشت میں تبدیل کرنا آسان کام نہیں۔ لیکن اگر آپ لوگ
متحد ہو کر فیصلہ کرلیں کہ اس نیک مقصد کے لئے اپنی جان پر کھیل
جانا ہے۔ تو کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ دنیا تمہیں عزت کا تاج

پہنائے گی۔ اور آنے والی نسلیں فخر سے تمہیں یاد کریں گی۔ صوبہ کے اختیارات اس وقت انگریز کے ہاتھ میں بالکل برائے نام ہیں۔ وزارت میں ایک بھی انگریز نہیں۔ ہم کس طرح سمجھ لیں کہ صوبہ کی بدحالی میں انگریز کی بدنیتی کو دخل ہے۔ میں پوچھتی ہوں کہ جب ہمارے موجودہ برسر اقتدار بھائی اپنے تھوڑے سے اختیارات کو صوبہ کی بہتری کیلئے صحیح طور پر استعمال نہیں کر سکے تو اب جبکہ ان اختیارات میں سال بھر بعد اور اضافہ ہونے والا ہے یہ لوگ کتنے زیادہ خطرناک ہو جائینگے؟ پس میں تمہیں مشورہ دیتی ہوں کہ آیندہ انتخابات میں صوبہ کی حالت کو نظر انداز نہ کرنا۔ اگر تم نے اسمبلی میں صحیح نمائندے بھیجے تو ہر ظلم اور بے انصافی کی جڑ خود بخود کٹ جائے گی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم سال بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ ہم قانون کی حد میں رہتے ہوئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم نے اپنی انجمن کی بنیاد ہی اس لئے رکھی ہے کہ ظلم رسیدہ لوگوں کی مدد کر کے انسانیت کا بول بالا کیا جائے جن لوگوں پر اس وقت زیادتیاں ہو رہی ہیں وہ بے تکلف ہمارے پاس آئیں۔ ہم ان سے انصاف کرائینگے۔ میں سمجھتی ہوں کہ صوبہ کے ہر نوجوان مرد اور عورت کو ہماری انجمن کا ممبر بننا چاہیے۔ صوبہ کی بہتری کا یہی اور صرف یہی ایک راستہ ہے۔ ہماری انجمن مذہبی تفریق سے بالا ہے۔ اسمیں کسی فرقہ کی تمیز نہیں۔ بلکہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں صاف کہدوں مذہب سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔"

اس لیکچر کے متعلق اخبار میں خبر پڑھ کر میں نے سمجھا تھا۔ کہ اوشا کوئی پختہ عمر کی عورت ہوگی۔ مگر یہاں ایک چوبیس پچیس سال کی جوان لڑکی دھواں دھار تقریر کر رہی تھی۔ اوشا سر سے پاؤں تک آگ کا شعلہ بنی ہوئی تھی۔ وہ سٹیج پر خود جل رہی تھی۔ اور اپنی گرمی سے حاضرین کو جلا رہی تھی۔ سرو قد، نہایت مناسب اعضاء، رنگ ایسا کہ ہوا لگنے سے میلا ہو۔ زبان میں وہ شیرینی کہ نیم کے درخت سے مخاطب ہو تو اسے آم لگیں۔ یہ سب کچھ سہی۔ مگر جاذبیت اور کشش کا مرکز اس کا چہرہ تھا۔ یوں سمجھئے کہ بہشت بریں کی روح اوشا کا چہرہ بن کر سٹیج پر آگئی تھی۔ تقریر کرتے وقت چہرہ جس طرف مڑ جاتا ہزاروں دلوں کا فیصلہ کر دیتا۔ اس کی ظالم نگاہیں۔ خدا کی پناہ! کون انسان تھا۔ جو ان تیروں کی بوچھاڑ برداشت کر سکتا۔ اس نے مذہب سے بیزاری کا اظہار کیا۔ مجھے ڈر ہوا کہ صورت پرست نوجوان کہیں خدا کو بھلا کر اوشا کی پوجا شروع نہ کر دیں۔ وہ ہر لحاظ سے حسن کا مکمل نمونہ تھی۔ اس کی آواز میں جادو تھا۔ یہ تو خیر گزری کہ اس نے نوجوانوں کو حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کا حکم نہ دیا۔ ورنہ کچھ عجب نہ تھا کہ لوگ اسی وقت جانوں پر کھیل جاتے۔ خود مجھ میں اس تقریر کا اتنا اثر تھا کہ اگر اوشا مجھے دریا میں کود نے کو کہہ دیتی تو میں فوراً اس کے حکم کی تعمیل کرتا۔

تقریر ختم ہوئی۔ ہال میں ہر طرف مکمل سکوت تھا۔ تعجب اور استغراق سے حاضرین کے منہ کھلے تھے۔ نگاہیں سٹیج پر جمی ہوئی تھیں۔ اور کسی کو تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ رفتہ رفتہ ہال میں انسانی زندگی کے آثار نظر آنے لگے

ہوش نے پہلو بدلا۔ حواس نے انگڑائی لی۔ دلوں کی حرکتیں سنائی دینے لگیں۔ اور آہستہ آہستہ زبانوں پر تعریف و توصیف کے کلمات جاری ہونے لگے۔ زبانیں کچھ تیز ہوئیں۔ ساتھ ہاتھوں کو بھی جنبش ہوئی۔ حاضرین نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر پورے جوش سے "زندہ باد اوشا دیوی" کے نعرے لگائے اوشا دیوی بڑی تمکنت سے نوجوانوں کے حلقہ میں سٹیج سے نیچے اتری اور موٹر میں بیٹھ کر چل دی۔

نیشنل ہال سے نکل کر ہم دور تک ساکت و صامت چلے گئے۔ آخر اشرف نے مہر سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"اوشا کی تقریر سے آپ نے کیا نتیجہ نکالا؟"

میں:۔ "اوشا کی تقریر میرے اچھی کہدینے سے اچھی نہیں ہوسکتی۔ اور میرے بری کہدینے سے بری نہیں ہوسکتی۔ اس کی صحیح قدر و قیمت سے آپ اتنے ہی واقف ہیں جتنا میں واقف ہوں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے سچ پوچھو تو یہی سمجھ رہا ہوں۔ کہ وہ میرے دل کی بات بیان کر رہی تھی۔ وہ میرے دل کی گہرائیوں سے میرے خیالات کس طرح نکال لائی؟ میں خود یہ خیالات کیوں بیان نہیں کرسکتا؟ یہ خیالات میرے ہیں۔ اس کے نہیں یقیناً وہ ساحرہ ہے۔ اسے یقین تھا کہ اس کی تقریر سننے میں آؤنگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے میرے دل کی کہنی شروع کر دیں۔"

اشرف "میں ایک کاروباری آدمی ہوں مجھے تقریروں سے کچھ علاقہ نہیں کہتے ہیں تقریر بھی ایک فن ہے۔ بہترین تقریر اسے شمار کیا جاتا ہے

جسے سن کر ہر شخص یہی سمجھے کہ اس کے دل کی بات کہدی۔ یہ تمہیں پر منحصر نہیں کہ اس کی تقریر کو اپنے خیالات سمجھتے ہو۔ حاضرین میں سے جس آدمی سے آپ پوچھتے۔ یہی جواب دیتا کہ اوشا نے اس کے دل کی بات کہہ دی۔ ہم اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ اوشا کی تقریر اس سے پہلے کبھی نہیں سنی۔ یہ اسکی پہلی تقریر ہے۔ اگر اس کی ابتدا یہ ہے تو انتہا کیا ہوگی۔ مگر میں نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ آپ نے اس تقریر سے کیا نتیجہ نکالا؟

یہی۔ یہی کہ اوشا جیسی حسین و نازک لڑکی کا ملکی خدمت جیسے نا ملائم اور کھردرے فرائض کو اپنے ذمہ لینا ایسا ہی ہے جیسے پھول کی پنکھڑیاں نکیلے سنگریزوں کو دوستی کی دعوت دیں۔ یا ریشم کا غلاف کانٹوں پر چڑھانے کی کوشش کی جائے۔ ملک کی خدمت بہت بلند جذبہ ہے۔ لیکن قدرت ہر انسان کو کسی خاص کام کے لئے پیدا کرتی ہے۔ معماری ایک فن ہے۔ لیکن ایک اچھا معمار ضروری نہیں کہ زرگر بھی ہو۔ معماری کے لئے معمار اور زرگری کے لئے زرگر ہی موزوں ہیں۔ ملکی خدمت جیسے کٹھن کام کیلئے سخت جان مرد ہی ٹھیک ہے۔ ملکی خدمت کے راستہ میں جو مشکلیں درپیش ہیں۔ غالباً اوشا سے وہ پوشیدہ نہ ہوں گی۔ اگر اس کا دل ہم پہم ان عملی مشکلات سے گھبرانے والا نہیں تو خواہ قدرت نے اسے نرم و نازک بنا کر نرم و نازک فرائض ہی سونپے ہیں۔ وہ اپنی قابلیت اور محنت سے اپنے ارادہ میں ضرور کامیاب ہوگی۔"

اشرف میرے مکان تک میرے ساتھ آیا۔ وقت زیادہ ہو چکا تھا

تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھ سے رفاقت کی۔ وہ میرے دروازہ کے قریب سے واپس لوٹ گیا۔ نہ میں نے اسے اندر آنے کیلئے کہا۔ نہ اس نے زیادہ ٹھہرنا مناسب سمجھا۔

میں کھانے پر بیٹھا۔ ہاتھ مشین کی طرح چل رہے تھے۔ لقمے میرے مُنہ میں پہنچ رہے تھے۔ مجھے اتنا ہوش نہ تھا کہ میں کیا کھا رہا ہوں اور نہ اتنا شعور تھا کہ کتنا کھانا چاہیے۔ کھانا سامنے تھا ہاتھ اور منہ اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ میرے دل اور دماغ پر اوشا اور اوشا کی تقریر چھائی ہوئی تھی۔ ذہن نے تصور کی آنکھ سے دیکھا۔ کہ اوشا تقریر کر رہی ہے حیرانی سے لوگوں کے مُنہ کھلے ہیں۔ اور میں سن رہا ہوں "جن لوگوں سے بے انصافیاں ہوئی ہیں۔ ہم ان کا انصاف کرائیں گے" میں نے دل میں کہا کہ کیا مجھ سے بے انصافی نہیں ہوئی؟ میری زندگی کا نصب العین ہیڈ کلرک بننا تھا۔ میں چار دفعہ اس اسامی کا حق دار ہوا۔ چاروں دفعہ مجھے بے انصافی سے نظر انداز کر دیا گیا۔ کیا میں مظلوم نہیں ہوں؟ اور اوشا کو میری مدد نہیں کرنی چاہیئے۔ مجھے اوشا سے ایک بار ضرور ملنا ہوگا۔ میں اُسے بتاؤں گا کہ ہمارا اسپرنٹنڈنٹ کتنا ظالم ہے۔ اگر انجمن کو کوئی کام کرنا ہے تو وہ ہمارے محکمہ سے شروع کرے۔

کھانا ختم ہوا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ہاتھ اور منہ چلنے سے رک گئے۔ اور میں نے سمجھ لیا کہ میں کھانا کھا کر فارغ ہو گیا ہوں۔ میں سوچنے لگا۔ کہ اوشا سے ملاقات کیسے کی جائے۔ کیا سیدھا اس کے مکان پر

چلا جاؤں۔ اور صاف صاف اپنی رام کہانی کہہ سناؤں۔ یا پہلے اُسے خط لکھ کر ملاقات کا وقت مقرر کر لوں۔ بڑے لوگوں کا وقت قیمتی ہوتا ہے۔ انہیں روزانہ میرے جیسے بیسیوں لوگوں کی درخواستیں سننی ہوتی ہیں۔ وہ ہر وقت فارغ نہیں ہوتے۔ ان سے ملاقات کا وقت پہلے مقرر کیا جاتا ہے۔ پھر خیال آیا کہ اوشا مجھے جانتی نہیں۔ کیا وہ محض میرے اس کے ہاں چلے جانے اور درد بھری کہانی سنا دینے سے اتنی متاثر ہو جائے گی۔ کہ پوری کوشش کر کے مجھے سپرنٹنڈنٹ کی اسامی دلا دے۔ نیشنل ہال میں ہزار ہا لوگ موجود تھے۔ ان میں بیشمار ایسے ہوں گے۔ جن سے میری طرح بے انصافیاں ہوئی ہوں گی۔ کیا وہ سب کے سب اوشا دیوی سے مدد کے لئے درخواست نہیں کریں گے؟ اوشا کس کس کی مدد کرے گی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہر شخص سے وہ انصاف کرا سکے؟ اس کا جذبہ بے حد قابل تعریف ہے۔ وہ یقیناً کوشش بھی کرے گی۔ لیکن کس کس کے لئے؟ مجھ میں آخر کونسی خصوصیت ہے۔ کہ وہ مجھے اوروں پر ترجیح دے میرا کام تبھی بن سکتا ہے۔ کہ وہ میرے معاملہ میں خاص دلچسپی لے۔ یہ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کے لئے کوئی خاص وجہ موجود ہو۔ لیکن میں کونسی وجہ پیدا کر سکتا ہوں؟ اگر میں وجہ پیدا کر سکتا تو اب تک ہیڈ کلرک نہ ہو گیا ہوتا۔

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے

اوشا سے اپنی ملاقات کو مؤثر بنانے کے لئے میں نے یکے بعد دیگرے کئی تجویزیں سوچیں۔ ہر تجویز کی خامیوں پر نظر کی اور اسے رد کر دیا۔ اس ادھیڑ بن میں کافی وقت گزر گیا۔ آخر ایک ترکیب سوجھی جسے دل اور دماغ دونوں نے قبول کر لیا۔ میں نے اس پر مزید غور و خوض مناسب نہ سمجھا۔

سرکاری ملازمت میں داخل ہونے سے پہلے میں ایک دو اخباروں کا ایڈیٹر رہ چکا تھا۔ پروپیگنڈا کے فن سے مجھے واقفیت تھی۔ لیکن گذشتہ کئی سال نہ کوئی مضمون لکھا۔ نہ میں کسی اخبار کے دفتر میں گیا۔ کلرکی نے زندگی کی رو ایسی بدل دی۔ کہ جن دو ایک اخبار نویسوں سے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ بھی برسوں نہ ملنے کی وجہ سے منقطع ہو گئے۔ اب خیال پیدا کہ اوشا کی تقریر پر ایک مضمون لکھکر کسی اخبار میں شائع کرایا جائے اور شائع شدہ مضمون کو اوشا سے ملاقات کا ذریعہ بناؤں۔ یہ ذریعہ اس لحاظ سے بہت مؤثر ہوگا۔ کہ اوشا ایک انجمن کی صدر ہے۔ اور انجمن کو پروپیگنڈا کی ضرورت ہوگی اس خیال کے آتے ہی میں نے کاغذ سامنے رکھا اور خیالات کو ترتیب دیا کئی سال مضمون نویسی نہیں کی تھی۔ مہینوں خط تک لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ہر دو فقروں کے بعد سوچنا پڑتا کہ تیسرا فقرہ کس طرح پہلے دو فقروں سے جوڑا جائے۔ اخبار کے دو کالم کا مضمون جسے میں آٹھ دس منٹ میں لکھ لیتا تھا۔ آج مشق نہ ہونے کی وجہ سے دو گھنٹے میں ختم کر سکا۔

رات کے ۲ بج چکے تھے۔ مضمون کوٹ کی جیب میں ڈالا اور سو گیا۔
نوکر کو مستقل ہدایت تھی۔ کہ مجھے صبح پانچ بجے جگا دیا کرے۔ اس نے مجھے ٹھیک پانچ بجے جگا دیا۔ کم سو سکنے کی وجہ سے طبیعت تھکی ہوئی تھی۔ جسم ٹوٹ رہا تھا۔ لیکن وقت پر ہسپتال میں حاضر ہونا ضروری تھا۔ اٹھا، نہایا دھویا۔ معمولی سا ناشتہ کیا اور ہسپتال پہنچ گیا۔
پرانے دفتر میں ہر صبح سپرنٹنڈنٹ کا خشمگیں چہرہ دیکھ کر شگفتہ طبیعت پر مردنی سی چھا جاتی۔ اس کے مغرور رویہ پر دل پر سارا دن بوجھ سا رہتا۔ آج صبح ہسپتال میں ڈاکٹر ثریا کا ہنستا ہوا چہرہ دیکھا۔ تو رات کم سونے سے جو کوفت ہو گئی تھی۔ وہ فوراً جاتی رہی۔ ہسپتال کی ڈاک بہت بھی کم ہوتی ہے اور پھر یہ ہسپتال ابھی نیا نیا کھلا تھا۔ کام بالکل برائے نام تھا۔ وقت کا زیادہ حصہ دوائی والے کمرہ میں شیشیوں کے لیبل پڑھنے گزرا دو ایک چٹھیاں جواب طلب تھیں۔ ان کے جواب ٹائپ کر لئے تو دن بھر کا کام ختم ہو گیا۔ میرے دفتر کا وقت صبح سات بجے سے ایک بجے بعد دوپہر تک تھا۔ میں انتہائی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ کہ ایک بجے اور میں اپنا مضمون لے کر ایڈیٹر کے پاس پہنچوں۔ ادھر ایک بجا ادھر میں دفتر سے اٹھا۔ سیدھا روزنامہ "انسان" کے دفتر میں پہنچا۔ اس کا ایڈیٹر کبھی میرا گہرا دوست تھا۔ کئی سال اس سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ پھر بھی یقین تھا کہ وہ مجھے بھولا نہیں ہو گا۔ میرا خیال صحیح نکلا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اور بڑے تپاک سے ملا۔ میرا خیال تھا میرے

ایڈیٹری چھوڑ کر کلرکی میں اپنی عمر ضائع کرنے پر وہ ضرور مجھے ملامت کریگا لیکن جب میں نے جھجکتے جھجکتے اسے بتایا کہ میں کلرک ہوں اور عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزر رہی ہے۔ تو اس نے رازداری کے لہجہ میں کہا۔

"بھائی آپ بڑے اچھے رہے۔ میں کئی اخباروں کی خاک چھان چکا ہوں۔ ہندوستانی اخباروں کے مالک سخت نادہند ہیں۔ متواتر کئی کئی مہینے تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے ہر دو تین سال بعد ایک اخبار کو چھوڑ دوسرے اخبار کی ایڈیٹری کرنی پڑتی ہے۔ مجھے اخبار "انسان" میں کام کرتے تین سال ہو گئے ہیں۔ گیارہ ماہ کی تنخواہ مالک کے ذمہ ہے اب اگر ملازمت چھوڑ دوں۔ تو بقایا وصول ہونے کی صورت نہیں۔ کام کرتا ہوں تو رفتہ رفتہ بقایا میں اضافہ ہوتا جائیگا۔ آپ کی تنخواہ کم سہی۔ آپ کو یقین ہوتا ہے کہ پہلی تاریخ کو اتنی رقم لازمی طور پر مل جائے گی آپ اسی رقم کے مطابق اپنی ضروریات کی قطع و برید کر سکتے ہیں۔ یہاں ہماری پہلی تاریخ کئی دفعہ تین تین مہینے کے بعد آتی ہے۔ آپ بہت اچھے رہے بھیا۔ ہم سے نادانی ہوئی۔ ہمیں بھی کلرک بن جانا چاہئے تھا۔"

میں نے اسے بتایا کہ میرا اسلام روستانی بے غرض نہیں مطلب پرستی مجھے آپ تک کھینچ لائی ہے۔ مطلب بہت سادہ ہے۔ اسے کسی تمہید کی ضرورت نہیں ایک مضمون آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اسے نمایاں طور پر شائع کر دیجئے۔ اس کے چھپ جانے پر اخبار کا ایک پرچہ

ادشادیوی کو اپنے تعارفی خط کے ساتھ بھیج دیں۔ اسکے سامنے مجھے بطور مضمون نگار کے کچھ اس طرح پیش کیجئے۔ کہ وہ مجھے ملاقات کے لئے بلا لے۔ اگر اوشا مہربان ہو گئی۔ اور اس نے میرے معاملہ میں دلچسپی لی تو میرا اسپرنٹنڈنٹ بن جانا یقینی ہے۔

ایڈیٹر نے یہ فرض اپنے ذمہ لے لیا۔ اور وعدہ کیا کہ نتیجہ کے متعلق وہ مجھے ہسپتال میں ٹیلیفون کر دیگا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور کامیابی کے لئے دل ہی دل میں دعا مانگتا ہوا رخصت ہوا۔

گھر پہنچکر کھانا کھایا اور قیلولہ کی نیت سے لیٹ گیا گرمی بہت زیادہ تھی۔ پھر بھی مردوں سے شرط باندھ کر سویا۔ شام کے چھ بج گئے۔ شاید اب بھی بیدار نہ ہوتا۔ نوکر نے چلا کر کہنا شروع کیا۔

"بابو جی! باہر کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ اشرف خاں نام بتاتے ہیں۔"

میں اٹھا۔ دل میں پھر وہی شبہ پیدا ہو گیا۔ کہ اشرف مجھ پر مہربان کیوں ہے۔ میں نے خود ہی اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے سمجھایا کہ کیا میرا مظلوم ہونا ہی اس بات کے لئے کافی وجہ نہیں کہ لوگ مجھ پر مہربان ہوں۔

میں اٹھا اور باہر آ کر اشرف کو اندر لے گیا تھوڑی ہی دیر میں ہم ساری دنیا پر تنقید کر رہے تھے۔ اشرف سے یہ میری دوسری ملاقات تھی اس مختصر عرصہ میں وہ مجھ سے اتنا بے تکلف ہو گیا۔ جیسے ہم برسوں سے

دوست ہیں۔ اس نے میرے حالات دریافت کئے۔ میں نے بتا دیئے وہ سب کچھ سن کر بولا۔

"معاف کیجئے دنیا میں آپ کو کوئی سہارا نہیں ملا۔ ورنہ اتنی قابلیت اور تجربہ رکھنے والے آدمی کو حکومت کے کسی شعبہ کا سیکرٹری ہونا چاہئے تھا۔ میری رائے میں آپ سیکرٹری کے اہل ہیں۔ میں کاروباری آدمی ہوں سرکاری محکموں سے میرا کوئی تعلق نہیں پھر بھی بعض افسروں سے میری یاد اللہ ہے۔ کسی وقت سوچیں گے کہ آپ کو سپرنٹنڈنٹ بنانے میں کس کس کی سفارش مفید ہو سکتی ہے۔"

مجھے روشنی کی ایک اور جھلک نظر آئی۔ میرے دماغ نے دل کو سخت ملامت کی کہ اس نے بغیر سوچے سمجھے اشرف پر شبہ کیا۔ ہمدرد لوگ ہمیشہ دوسروں کے کام آتے ہیں۔ یہ اشرف کا احسان ہے کہ وہ مجھ سے یوں پیش آرہا ہے۔ خیال آیا کہ اشرف کو بتا دیا جائے کہ میں نے ادشا سے مدد لینے کا موثر طریقہ پیدا کر لیا ہے۔ دل نے یہ بات نہ مانی۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ اشرف نے اگر میری مدد کرنی ہے تو وہ بہر حال کریگا۔ ادشا کا ذکر کرنے سے اس کی ہمدردی میں کچھ اضافہ نہیں ہو جائے گا۔ یہ بھی تو پتہ نہیں کہ ادشا مجھ سے کس طرح پیش آئے۔ فرض کیجئے۔ وہ مجھے کلرک سمجھ کر منہ نہ لگائے پھر کیا ہوگا؟ اشرف کی نظروں سے بھی گر جاؤں گا۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ ادشا کا نام تک زبان پہ نہ لایا جائے۔

دوسرے دن صبح اٹھتے ہی میں نے اخبار "انسان" کا پرچہ خریدا۔ یہ دیکھ کر آنکھیں روشن ہوگئیں کہ ایڈیٹر نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے میرا مضمون لیڈر والے صفحہ پہ نوٹ کی جگہ شائع کیا ہے۔ مضمون کو کئی بار پڑھا۔ ہر بار نیا ہی لطف آیا۔

ہسپتال میں دفتر کا وقت بڑی خوشی سے کٹ رہا تھا۔ طبیعت میں چستی اور خون میں حرارت محسوس ہوتی رہی ساڑھے گیارہ بجے مجھے ڈاکٹر ثریا نے طلب فرمایا۔ میں نوٹ بک اور پنسل لے کر حاضر ہوا تو اس نے مجھے بتایا کہ مجھے ٹیلیفون پر کسی نے بلایا ہے۔ ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا تو ایڈیٹر 'انسان' کہہ رہا تھا۔

"آج جمعہ ہے۔ اتوار کو ساڑھے دس بجے ادشا نے آپ کو اپنے مکان پر ملاقات کے لئے بلایا ہے۔"

خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں۔ میں نے ایڈیٹر کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ اور ٹیلیفون بند کردیا۔ ٹیلیفون ڈاکٹر ثریا کی میز پر تھا۔ وہ ہر دو چار سیکنڈ کے بعد میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ٹیلیفون بند کیا ہی تھا کہ ارشاد ہوا۔

"کس نے بلایا تھا ٹیلیفون پر؟"

"ایڈیٹر 'انسان' نے" میں نے عرض کیا۔

"وہ تمہارا دوست ہے؟"

"جی ہاں"

ڈاکٹر ثریا کچھ حیران سی تھی۔ اور اس پر حیرانی کا مفہوم صرف اس قدر تھا۔ کہ ایک کلرک کا دوست ایڈیٹر جیسا بڑا آدمی کیونکر ہو سکتا ہے۔

تیاری

مجھے بڑی بے تابی سے انوار کا انتظار تھا۔ میری تدبیر کامیاب ہو چکی تھی۔ واقعات کی رفتار سے میں نے اندازہ کیا کہ میری تدبیر اور تقدیر دونو اس وقت متفق ہیں۔ جب انسانی تدبیر اور خدائی تقدیر ہم آہنگ ہوں دنیا میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایک کلرک کا سپرنٹنڈنٹ بن جانا کتنا ہی مشکل سہی۔ جب ظاہری اسباب انسان کے ہاتھ میں ہوں اور آسمانی تائید اس کے حق میں ہو۔ تو بڑی سے بڑی مشکل خود بخود دور ہو جاتی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اوشا سے ملاقات کے دوران میں ثابت کر دوں گا۔ کہ میں سپرنٹنڈنٹ بننے کا امیدوار بلاوجہ نہیں ہیں ثابت کر دوں گا۔ کہ میں دراصل اس قابل ہوں کہ سپرنٹنڈنٹ بن سکوں۔ میرا سپرنٹنڈنٹ نہ بن سکنا بہت بڑی ناانصافی ہے۔

میں اس آدمی کو قابل سمجھتا ہوں۔ جو اپنے آپ کو جس حیثیت میں دنیا کے سامنے پیش کرے۔ اس میں وہ اسی حیثیت کے دوسرے لوگوں سے ممتاز نظر آئے۔ میں کلرک سے ہیڈ کلرک نہ بن سکا اس کی وجہ میں

بیان کرچکا ہوں۔ لیکن یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ بطور کلرک کے میں بہت کامیاب تھا۔ کسی دوسرے کلرک کو اس انداز سے کلرکی کرنی نصیب نہیں ہوئی۔ جس انداز سے میں نے کی۔ یہ میری اپنی رائے نہیں۔ میرے محکمہ کے تمام کلرکوں کی متفقہ رائے میرے متعلق یہی تھی۔ مگر ادشا کے سامنے میں کیسے ثابت کرسکتا ہوں کہ میں صرف کلرک ہی نہیں بلکہ بہت بڑا کلرک ہوں؛ میں اپنے دفتر کے فائل اٹھا کر اس کے پاس لے جا نہیں سکتا تھا کہ سرکاری چٹھیوں کے حوالے پھرتی سے نکال نکال کر اس کے سامنے پیش کیئے جاتا۔ کسی دوسرے محکمہ سے آئی ہوئی طویل سے طویل چٹھی کا جواب پانچ دس سطروں میں لکھ کر ادشا کو بتا دیتا کہ یہ جواب اس محکمہ کا منہ بند کردیگا۔ یہ بھی ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو ہمارے محکمہ کا افسر سمجھ کر کسی معاملہ کے متعلق کوئی بات کرتی اور میں بڑے سلیقہ سے اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتا۔ ان باتوں میں سے ایک بھی ادشا کے سامنے نہیں ہوسکتی تھی۔ پھر میں اسے کیسے یقین دلاتا کہ میں کامیاب کلرک ہوں۔ اب مجھے سوجھا کہ میں اوشا کے روبرو کلرک کے نہیں جارہا۔ اس نے مجھے ایک نامہ نگار کی حیثیت سے بلایا ہے۔ وہاں مجھے اپنے آپ کو ایک کامیاب اخبار نویس ثابت کرنا چاہیئے اگر میں نے ثابت کردیا کہ میں ایک کامیاب اخبار نویس ہوں تو اسے اپنی مدد پر آمادہ کرلینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اوشا ایک انجمن کی صدر ہے۔ اسے اپنی انجمن کے لیئے پروپیگنڈا کی ضرورت ہے۔ اگر وہ

میری باتوں سے متاثر ہوگئی تو آئندہ مجھ سے کام لینے کی صورت سوچے گی اور وہ صورت یہی ہوگی کہ مجھے سپرنٹنڈنٹ بنوا دے۔ میرا کامیاب کلرک ہونا اس کے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔ میرا کامیاب اخبار نویس ہونا خود اسے ایک حد تک میرا محتاج کر دیگا۔ اور میں اس سے پوری پوری مدد لے سکوں گا۔

جس طرح ایک کامیاب مغنّی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی انگلیاں بڑی بے تکلفی سے تاروں پر چلیں اور ہر تار سے وہ صرف اس قدر مس ہوں کہ جتنا نغمہ پیدا کرنے کے لئے ضروری ہو۔ ٹھیک اسی طرح ایک کامیاب اخبار نویس کے لئے لازم ہے کہ اس کی نظر ملکی حالات کا جائزہ اس تیزی سے لے کہ رفتارِ زمانہ اپنی سُرعت کے باعث کوئی واقعہ اخبار نویس کی نظر سے بچا کر نہ لے جا سکے۔ واقعات کی صحیح وسعت کا درست اندازہ اخبار نویس کی کامیابی اور غلط اندازہ اس کی ناکامی ہے۔

جمعہ اور ہفتہ دو دن میں نے اخبارات بڑی توجہ سے پڑھے۔ ملکی حالات کا اندازہ کیا۔ ریاض آباد کی دوسری انجمنوں کے اغراض و مقاصد پڑھے۔ اوشا کی تقریر پر پھر غور کیا۔ اس میں روسی اشتراکیت کی تبلیغ نظر نہ آئی۔ مگر عام نوجوانوں کے ذہن اس طرف مائل پائے۔ روسی اشتراکیت پر دو ایک کتابیں لائبریری میں جا کر جستہ جستہ پڑھیں اور بعض باتیں ساتھ ساتھ نوٹ بھی کرتا گیا۔ اب مجھے یقین ہوگیا کہ میں اوشا

سے ملاقات کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہوں۔ میں ثابت کر دوں گا کہ نوجوانوں کی تنظیم سے متعلق اصول سے میں بے بہرہ نہیں ہوں۔

پہلی ملاقات

آخر اتوار آیا۔ میں صبح جلد ہی اٹھ بیٹھا۔ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر بہترین سوٹ پہنا۔ آئینہ کے سامنے کئی زاویوں سے اپنے آپ کو دیکھا۔ کالر ٹائی کو درست کیا۔ لائبریری میں جو نوٹ لئے تھے۔ انہیں ایک دو بار دہرایا۔ اور آٹھ بجے ہی اوشا کے بنگلہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ ملاقات کا وقت ساڑھے دس بجے مقرر تھا۔ میں اس کے بنگلہ کے سامنے نو بجے سے پہلے ہی پہنچ گیا۔ مقررہ وقت سے پہلے اندر جانا مناسب نہ سمجھا۔ وقت کاٹنے کی خاطر بنگلہ سے آگے نکل گیا۔ اور ملاقات کے پروگرام کو دل ہی دل میں ترتیب دینے لگا۔ خیالات میں تسلسل قائم کیا۔ بعض خاص نعرے سوچے۔ اور ہر خاص فقرہ ایک خاص جسمانی حرکت کے ساتھ ادا کرنے کی ٹھہرائی۔ خیال ہوا کہ اس کی مشق آئینہ کے سامنے ہونی چاہیے تھی۔ بہت چوک ہوئی۔ تیاری کا یہ حصہ ناتمام رہا۔

میں اپنے خیالات میں غرق بہت آگے جا چکا تھا۔ پھر واپس لوٹا اور ٹھیک ساڑھے دس بجے بنگلہ میں داخل ہو کر اپنا ملاقاتی کارڈ ادشا کے نوکر کو دیا کہ وہ اُسے ادشا تک پہنچا دے۔ یہ کارڈ میں نے صرف ادشا سے ملاقات کے لئے چھپوائے تھے۔ اور ان پر صرف "بشیر بی۔ اے" لکھا تھا۔ لفظ "کلرک" میں نے "مصلحتاً" نہیں شامل کیا تھا۔ کہ سپرنٹنڈنٹ بن جانے کی صورت میں یہ کارڈ بیکار ہو جائیں گے۔ ادشا کا نوکر واپس لوٹا اور ہاتھ کے اشارہ سے مجھے پیچھے آنے کو کہا۔ وہ مجھے ادشا کے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ڈرائنگ روم کیا تھا انگریزی بہشت کا بہترین نمونہ تھا۔ فرش پر ایرانی قالین۔ اس پر دو نہایت قیمتی صوفہ سیٹ۔ ایک طرف کتابوں سے سجا ہوا شیشے کا شوکیس۔ اور دیواروں پہ آٹھ دس تصویریں آویزاں۔ ان تصویروں میں دو ایک مناظر سوئیٹزرلینڈ کے تھے باقی تصویروں میں لارڈ ولنگٹن۔ جارج برناڈ شا۔ سوبھاش چندر بوس۔ لینن اور جواہر لال کی تصویریں خاص طور پر قابل ذکر تھیں۔ کمرہ کی فضا خواب آور تھی۔ صوفے پر بیٹھتے دل و دماغ کو ذرا سکون محسوس ہوا۔ اور میں نے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ جلد ہی دروازہ کی راہ سے معطر ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا۔ جو میری روح تک کو مست کر گیا۔ میں اس کیفیت سے پوری طرح لطف اندوز نہ ہونے پایا تھا کہ ادشا "معاف کیجئے آپ کو میرا انتظار کرنا پڑا" کہتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ میں ازراہِ تعظیم اُٹھا۔ اس نے ہاتھ ملایا۔ خود بیٹھ

گئی اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ مگر میرے اعضاء اوشا کے رعب سے معطل ہو رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ میرے اعضاء کو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ اور یہ ایک ایک کر کے میرے جسم سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ صرف میری روح موجود ہے۔ جسم باقی نہیں رہا۔ ایک منٹ تک کامل خاموشی رہی۔ پھر اوشا نے میرے مضمون کی تعریف کی اور کہا کہ وہ بہت پر مغز اور دلچسپ تھا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے اس کی تقریر میں دلچسپی لی۔ اور اس کے بعض نکات کو تنقید کی صورت میں اخبار کے ذریعہ عوام تک دوبارہ پہنچایا۔ میں نے عرض کیا۔

"مضمون آپ کی تقریر پر مبنی ہے۔ اس میں آپ کی تقریر کے بعض اجزا کو دوبارہ عوام کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر میرا مضمون ٹھوس اور دلچسپ ہے تو یہ خود آپ کی تقریر کی خوبی ہے۔ اس حقیقت سے اندازہ فرما لیجئے کہ آپ کی تقریر کتنی کامیاب تھی۔"

اس پر اوشا نے اظہارِ انکساری کیا۔ پھر بتایا کہ اب وہ ہر مہینے نیشنل ہال میں نوجوانوں کے سامنے تقریر کیا کریں گی۔ اور انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اپنی زندگی ملکی خدمت کے لئے وقف کر دیں گی۔ اوشا کی اس ارشاد پر میں نے جرأت کر کے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اور بلاارادہ میرے منہ سے نکل گیا۔

ملکی خدمت ایک خاردار مسئلہ ہے۔ جیل جانے اور دوسری

"تکلیفیں اٹھانے کے نہ صرف امکانات ہیں۔ بلکہ یہ اس کے لوازمات ہیں۔ کیا آپ نے مسئلہ کے اس پہلو پر غور فرمایا ہے؟
اوشا نے جواب دیا۔
"آپ سمجھتے ہیں کہ اوشا ایک رائے بہادر کی لڑکی ہے۔ اس نے بنگلوں میں پرورش پائی ہے۔ وہ کوئی سخت کام نہیں کر سکتی۔ آپ کا یہ خیال صحیح نہیں۔ میرا جسم جو کچھ ہے سو ہے۔ مگر میرا دل فولاد کی طرح مضبوط ہے۔ ملکی خدمت کے راستہ میں مجھے جو مصیبت برداشت کرنی پڑے۔ اسے میرا دل راحت سمجھے گا۔ آرام اور تکلیف دراصل دو مہمل لفظ ہیں۔ ہم زندگی کے متعلق جو نظریہ قائم کر لیتے ہیں۔ اس کے مطابق واردات کو آرام یا تکلیف کا نام دیتے ہیں۔ زندگی کا جو تصور میرے ذہن میں ہے۔ اس کی رد سے ملکی خدمت کرتے وقت جو واردات پیش آئیں۔ وہ آرام کی ذیل میں آتی ہیں۔ واردات کا نزول دل پر ہوتا ہے۔ اگر دل ایک واردات کو آرام کہے تو دنیا کا اسے تکلیف کہنا غلط ہے۔ جو واردات مجھے پیش آتی ہے۔ اس کے متعلق دوسرے لوگ کیونکر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ میرے نقطۂ نگاہ سے آرام ہے یا تکلیف؟"
میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔
"مجھے آپ کے اس کلیہ سے پورا اتفاق ہے۔ زندگی کے متعلق آپ کا نظریہ بہت بلند ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو اپنے ارادہ میں کامیاب کرے۔ میرے دل میں ایک سوال پیدا ہوا تھا۔ وہ میں نے

کر دیا - میں اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ خیالات کی یہ بلندی اور مقاصد کی یہ پاکیزگی مجھے کسی دوسرے شخص میں نظر نہیں آئی۔"

میں نے دیکھا کہ میری اس تعریف سے اوشا کا چہرہ خوشی سے پھول کی طرح کھلا جا رہا تھا - اور وہ اپنی اس خوشی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی - میں نے اپنے دل میں کہا - آخر عورت ہے - یہ اپنے خیال میں لوہے کا دل کیوں نہ رکھتی ہو - حساس ہونا اس کی فطرت ہے - وہ بدل نہیں سکتی - میں اپنے آپ پر قابو پا چکا تھا۔ اوشا کے نسوانی حسن اور اس کی قابلیت کے سامنے اگرچہ اب بھی میرے اعضا میں تعطل موجود تھا - اس کی بے تکلف گفتگو اور برابر کے سلوک نے مجھے قوت بخشی اور میں اس قابل ہو گیا کہ گفتگو کا رخ اپنے سوچے ہوئے موضوع کی طرف پھیروں - اس وقت تک اوشا بحث و گفتگو میں مجھ پر غالب تھی - میں صرف اس کی تائید کر رہا تھا - اب میں نے انجمن کے مقاصد معلوم کرنے چاہے - اوشا نے مجھے بتایا کہ نوجوانوں کا دماغی رجحان اشتراکیت کی طرف زیادہ مائل ہے - اور وہ خود بھی اشتراکیت کو پسند کرتی ہے - مگر وہ روسی پروگرام نوجوانوں کے سامنے فوراً نہیں رکھنا چاہتی - وہ سمجھتی ہے کہ اس کے لئے ایسی تنظیم کی ضرورت ہے - جو ایک خوفناک طاقت کی حیثیت رکھتی ہو - اس سے پہلے ایسے پروگرام کو حکومت شک و شبہ کی نظر سے دیکھے گی - اور اس تحریک کو کچل دے گی میں نے اشتراکیت کے متعلق لکھی ہوئی یادداشت کو اپنے ذہن میں تازہ کیا۔

اور اپنے آپ پر پورا بھروسہ کرتے ہوئے کہا۔

"اشتراکیت اچھی چیز ہے۔ مگر یہاں کے حالات اور روس کے حالات میں فرق ہے۔ یہاں اشتراکیت کو رواج دینے سے پہلے ہمیں اس میں تھوڑا سا رد و بدل کرنا پڑیگا۔ سو فی صدی روسی اشتراکیت یہاں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ہندوستان روس نہیں اور نہ روس کی روایات ذہنی ارتقاء ہندوستان کی روایات و ذہنی ارتقا ہوسکتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس نکتہ کو اگر صحیح طور پر نہ سمجھا گیا تو آپ کے سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا نیشنل ہال میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ آپ مذہب کو نہیں مانتیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستانی لوگ مذہب کے نام پر کٹ مرنا فخر سمجھتے ہیں۔ وہ کسی مسئلہ میں دلچسپی نہیں لیتے جب تک اسے مذہب کا رنگ نہ دیا جائے۔ مذہب ہندوستان کی فطرت میں داخل ہے۔ اسے آپ جدا نہیں کرسکتیں۔ ادھر روسی اشتراکیت مذہب کی دشمن ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ یہاں اشتراکیت کو رواج دینے کے لئے آپ مذہب کی مخالفت کریں گی۔ میری دانست میں اس قسم کا پروگرام ہرگز کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ اگر آپ کا اصل مقصد ہندوستانی نوجوانوں کی تنظیم اور ملکی خدمت ہے تو مذہب کی مخالفت کرنے کی بجائے ثابت کیجئے کہ اشتراکیت ہندوستان کے ہر مذہب کا حصہ ہے اشتراکیت کو قبول کرنا گویا مذہب کی خدمت ہے۔ پھر دیکھئے ہندوستانی کس طرح دیوانہ وار آپ کی بات مانتا ہے"

میری گفتگو کے دوران میں اوشا بالکل خاموش تھی۔ اس کے سر کی بے اختیار ہلکی ہلکی جنبشوں سے میں نے نتیجہ نکالا کہ وہ مجھ سے متفق ہے۔ اور میری تقریر پر اثر کر رہی ہے۔ جب میں نے اپنے ان خیالات کے متعلق اس کی رائے معلوم کی تو وہ صرف یہ کہہ کر چپ ہو گئی۔

"میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میں غور کروں گی۔ مجھے مہلت چاہیئے۔"

میں نے محسوس کیا کہ اوشا کا بحث میں مجھ سے یوں دب جانا صرف اسی وجہ سے نہیں کہ میرے پاس ایک زبردست دلیل موجود تھی۔ بلکہ اس میں اوشا کے عورت ہونے کو بھی دخل تھا۔ مرد کی نسبت عورت زیادہ حساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کو وہ خود اعتمادی حاصل نہیں جو مرد کو حاصل ہے۔ میں نے پھر کہنا شروع کیا۔

"میں آپ کے عزم اور نیک مقصد کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا ایک امیر گھر کی لڑکی ہونے کی حیثیت سے آپ کو دنیا کا ہر آرام میسر ہے تمام نعمتوں کے ہوتے ہوئے۔ آپ کے دل میں ملکی خدمت کا خیال پیدا ہونا آپ کی بلند فطرت کا ثبوت ہے۔ بڑے گھروں میں خدا کا دیا اور سب کچھ ہوتا ہے۔ ایک "زندگی" نہیں ہوتی۔ آپ کے گھر میں سب کچھ موجود ہے۔ اس کے علاوہ "زندگی" بھی ہے۔ اس لحاظ سے آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ آپ غریبوں سے اس لئے بہتر ہیں کہ انہیں جو کچھ حاصل نہیں وہ آپ کو حاصل ہے۔ اور امیر لوگ اس لئے آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کہ ان میں صرف عیش و عشرت کی حس ہوتی ہے زندگی

نہیں ہوتی۔ آپ میں زندگی موجود ہے۔"

ادشا بدستور کسی سوچ میں تھی۔ اس نے میرے ان الفاظ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو معلوم ہے۔ ہندوستان میں کتنے مذہب ہیں۔ ہر مذہب کی روایات جُدا ہیں۔ ہر مذہب کے لوگ سیاسی حالات کو اپنے مذہب کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ اور حالت یہ ہے کہ ایک مذہب مشرق کی طرف جانے کے لئے کہتا ہے۔ تو دوسرا مذہب مغرب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تیسرا مذہب جنوب کی طرف کھینچتا ہے۔ تو چوتھا شمال کی سمت دھکیلتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ تمام مذہبی لوگوں کی توقعات پوری کی جاسکیں۔ اس کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ کہ مذہب کو سیاست میں بالکل نہ لایا جائے میں یہ نہیں کہتی کہ مجھے آپ کی رائے سے اختلاف ہے۔ نہ میرا یہ مطلب ہے کہ میں آپ سے متفق ہوں۔ میں اس سوال پر غور کروں گی۔ یہ سوال غور طلب ہے۔ آپ بھی اس پر غور کیجئے ہمیں اپنی انجمن کو اس دلدل میں نہیں پھنسنے دینا چاہئے۔ ہم پھر کبھی مفصل گفتگو کریں گے۔"

اس کے بعد اخبارات کی پالیسی پر گفتگو ہوئی۔ اس موضوع پر مجھے کسی بناوٹ یا تکلف کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے صوبہ کے ہر قابلِ ذکر اخبار کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا اور کہہ دیا کہ ہمارے اخبارات عوام [illegible]

ادھر ہی کو ہو لیتے ہیں۔ آپ کی تقریر بڑی زندگی بخش تھی۔ اس پر بھی اخبارات نے اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ غالباً آپ نے انجمن کے لیے پروپیگنڈا کا کوئی مؤثر طریق ابھی تک نہیں سوچا۔ اس پر اوشا چونکی۔ اور فقط چونک کر رہ گئی۔ اسے خاموش دیکھ کر میں نے بھی زیادہ کہنا مناسب نہ سمجھا۔

دو گھنٹے کے بعد ملاقات ختم ہوئی۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے کا رسمی شکریہ ادا کیا گیا۔ میں چلنے کے لئے اٹھا۔ دماغ نے آواز دی "نالائق آدمی! تو کس مطلب کے لئے یہاں آیا تھا، اگر تجھے بھول گیا ہے تو لے میں بتاتا ہوں۔ تجھ سے چار مرتبہ ناانصافی ہو چکی ہے تو ہیڈ کلرک نہیں بن سکا۔ اب تیرا ارادہ سپرنٹنڈنٹ بننے کا ہے اوشا سے ملاقات کی تقریب پیدا کرنے کی خاطر تو نے بیسیوں پاپڑ بیلے۔ تاکہ اسکی مدد سے تو کامیابی حاصل کر سکے۔ اب جبکہ تو اوشا کے سامنے کھڑا ہے۔ تیرے ہونٹ کیوں سِل گئے۔ کیوں اس سے درخواست نہیں کرتا کہ وہ تیری مدد کرے۔ اب کیا سوچ رہا ہے۔ بول اور فوراً بول۔"

دل نے دماغ کو ڈانٹا۔

"تو دیکھتا نہیں کہ اوشا اور بشیر کے درمیان کتنے بلند مقصد کے لئے برابر کی گفتگو ہوتی ہے۔ اوشا ایک رائے بہادر کی لڑکی ہے اس کا علم وسیع ہے۔ نوجوانوں کی انجمن کی وہ بانی اور صدر ہے۔ ان

ساری خوبیوں کے باوجود محبت میں اس کا پلڑ نیچا رہا ہے۔ کیا اب بشیر سوالی بن کر اسی کے سامنے دو زانو ہو۔ یہ کبھی نہ ہوگا۔ زندگی سپرنٹنڈنٹ کی آسامی کا نام نہیں بلکہ خود داری اور دنقار کا نام ہے۔ بشیر تو یہاں کیوں کھڑا ہے۔ تیری ملاقات ختم ہوئی۔ اب اپنے گھر کی راہ لے

مجھے یاد آیا کہ دوران گفتگو میں اوشا نے میرے متعلق یہ کہا تھا کہ سیکرٹری بہت اچھا بن سکتا ہوں۔ اوشا کی نظر میں اپنے آپ کو اتنا بلند کرنے کے بعد کیا میں اُسے بتا دوں کہ میں دراصل ایک کلرک ہوں اور کلرک بھی وہ جسے سپرنٹنڈنٹ بننے کے لئے اوشا کی مدد درکار ہے۔

دل اور دماغ میں خیالات کی جنگ جاری تھی۔ کبھی خیال آتا۔ کہ اوشا سے اپنا حال عرض کردوں۔ الفاظ سوچتا۔ مگر زبان بغاوت کر دیتی۔ گلا اتنا سکڑ جاتا کہ الفاظ باہر نہ نکل سکتے۔ پھر سوچتا یہ مناسب نہیں۔ اوشا کی نظر میں اپنے آپ کو خواہ مخواہ کیوں گراؤں۔

چند منٹ کی کشمکش کے بعد جسے شاید اوشا نے بھی بھانپ لیا ہو۔ میں اوشا سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوا۔ اوشا نے کہہ دیا کہ اگر اسے مجھ سے دوبارہ گفتگو کرنے کی ضرورت ہوئی تو وہ مجھے اخبار" انسان" کے توسط سے خط لکھے۔

اوشا کے بنگلہ سے باہر نکل کر میں نے محسوس کیا کہ میری رگوں میں خون بڑی تیزی سے گردش کر رہا ہے۔ میرا جسم اتنا ہلکا تھا کہ اگر

میں چاہوں تو ہوا میں بے تکلف اڑ سکتا ہوں۔ میرے قدم بغیر کسی کوشش کے اٹھ رہے تھے۔ میں سر سے لے کر پاؤں تک مجسم خوشی بنا ہوا تھا۔ حالانکہ جس مقصد کے لئے میں آیا تھا۔ اس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

میں خیالات میں کھو گیا۔ اب میں کدھر جا رہا تھا۔ اس کا مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ ٹانگیں تھیں کہ خود بخود کسی سمت کو لئے جا رہی تھیں۔ میں چلتا گیا اور سوچتا گیا۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو ہسپتال کے کوارٹر میں پایا۔ یہ اتوار تھا۔ ہسپتال بند تھا۔ میں نے ابھی اپنا سامان کوارٹر میں منتقل نہیں کیا تھا۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ پھر میں اپنے مکان پر جانے کی بجائے کوارٹر میں کیوں چلا آیا۔ صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری ٹانگوں نے ادھر راہنمائی کر دی میں ادھر آ گیا۔ اگر یہ گھر کو لے جاتیں تو میں وہاں چلا جاتا۔ جب کوئی خاص کام سامنے نہ ہو تو ایک کنوارے آدمی کا گھر میں پڑ رہنا یا کہیں باہر وقت کاٹنا ایک ہی بات ہے۔

اوشا سے ملاقات نے بجلی کی جو رَو میرے جسم میں دوڑا دی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ دل اور دماغ اعتدال پر آئے اور میں نے سکون کے ساتھ صورت حال پر غور کرنا شروع کیا۔ معاملہ کے ہر پہلو کو دیکھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اوشا حسین ہے۔ قابل ہے۔ ملکی خدمت کا جوش اس کی رگ رگ

میں جاری ہے۔ ان ساری خوبیوں پر اس کی امانت ایسی ہی ہے جیسے سونے پر سہاگہ۔ یہ سب چیزیں اسے مجھ سے ممتاز کرتی ہیں۔ میں ایک کلرک ہوں۔ غریب آدمی ہوں۔ مجھ پر لازم ہے کہ میں اپنی حیثیت پہچانوں اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش نہ کروں۔ میں جو کچھ ہوں۔ اُسے خود تسلیم کروں۔ اور اوشا کو اس کا علم ہونے دوں۔ اپنی حقیقت کو چھپانا بزدلی اور ریاکاری ہے۔ خیالات نے پھر پلٹا کھایا۔ اور دل نے کہا۔ تو کلرک سہی، غریب سہی، لیکن کیا تو نے اوشا پر ثابت نہیں کر دیا کہ اگر تو اس سے زیادہ قابل نہیں تو اس سے کم بھی نہیں۔ میں ہرگز پسند نہیں کرتا کہ تجھے اوشا کے سامنے احساس کمتری ہو۔ تجھے اس سے برابری لازم ہے۔ تو اس کے برابر ہے۔ اور بالکل برابر۔ تو سمجھتا ہے تیرے یہ کہہ دینے سے کہ تو کلرک ہے۔ تو اوشا کی کوئی خدمت کریگا نادان بشیر! جب اوشا کو معلوم ہوا کہ بحث میں جس سے وہ دب گئی وہ ایک کلرک تھا۔ تو اس کی خودداری کو کتنی ٹھیس لگے گی۔ کیا اس کی خود اعتمادی متزلزل نہ ہو جائے گی؟ یہ سب کچھ ہوگا اور یقیناً ہوگا دل نے مجھے ملامت کرتے ہوئے کہا اگر تجھے احساس کمتری بھی ہے تو اوشا سے مدد کی بھیک مانگنا کیا ضرور۔ اس کی مدد کے بغیر سپرنٹنڈنٹ بن۔ سپرنٹنڈنٹ بننے کے بعد اُسے بتا کہ تو سپرنٹنڈنٹ ہے۔

میں نے آخر فیصلہ کر لیا کہ میں سپرنٹنڈنٹ ضرور بنوں گا لیکن اوشا کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ میں کلرک ہوں۔ اسے یہ علم نہیں ہوگا کہ میں

سرکاری ملازمت میں ہوں۔

ڈاکٹر ثریا

ڈاکٹر ثریا کے ماتحت آکر میں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ پرانے دفتر اور ہسپتال کے دفتر میں وہی فرق ہے جو دوزخ اور بہشت میں ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر ثریا ایک نہایت مہربان افسر تھیں۔ انھوں نے سپرنٹنڈنٹ کی طرح اپنی افسرانہ شان کا مظاہرہ کرنا تو ایک طرف مجھے کبھی یہ بھی محسوس نہ ہونے دیا کہ میں ان کے ماتحت ہوں یوں بھی دفتر میں کام تھوڑا تھا۔ جو کچھ تھا بھی وہ انھوں نے میری مرضی پر چھوڑ دیا۔ بظاہر اب بھی میں کلرک تھا۔ لیکن اپنے محدود دائرہ میں مجھے تمام اختیارات حاصل تھے۔ جو ایک سپرنٹنڈنٹ کو حاصل ہوتے ہیں۔ اب ڈاکٹر ثریا کو جب بھی مجھ سے کام لینا ہوتا۔ وہ نرس کو مجھ تک بھیجنے کی بجائے خود میرے دفتر کے قریب آکر آواز دیتیں۔ "بشیر!" اور واپس اپنی کرسی پر جا بیٹھتیں۔ میں سمجھ جاتا کہ میرے لئے کام کا وقت ہے۔ میں پنسل اور نوٹ بک لے کر فوراً حاضر ہو جاتا۔ اس قلیل عرصہ میں دو مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ڈاکٹر ثریا آواز دینے کے بعد خود دفتر کے اندر تشریف لے آئیں اور وہیں نوٹ لکھا

دیئے۔ میں دفتر میں اپنا فارغ وقت اخبار اور کتابیں پڑھنے میں گزارتا۔ اور میرے کان ڈاکٹر ثریا کی زبان سے لفظ "بشیر" سننے کے منتظر رہتے مجھے کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ میرے نام میں ایک خاص قسم کی کشش اور شیرینی موجود ہے۔ اب میں ڈاکٹر ثریا کی زبان سے اُسے سنتا۔ تو دیر تک میرے کان اس کے مزے لیتے رہتے۔

ایک دن میں نے ڈاکٹر ثریا کو اسسٹنٹ لیڈی ڈاکٹر سے یہ کہتے سنا کہ افسرانِ بالا اس ہسپتال کی رفتار ترقی کو بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں ابھی تک وہ یہ رائے قائم نہیں کر سکتے کہ حکومت نے جتنا روپیہ اسے کھولنے پر صرف کیا ہے۔ عوام کو اس کے مطابق فائدہ پہنچ رہا ہے یا نہیں۔ اگر افسروں کی تسلی نہ ہوئی تو وہ یہاں کی ڈاکٹروں کو تبدیل کر کے نئی ڈاکٹروں کو متعین کر دیں گے۔ یہ سنتے ہی میں نے وہ رجسٹر دیکھا جس میں ہر مریض کا نام اور اس کے مرض کی تفصیل درج ہوتی ہے اور چیدہ چیدہ امراض کے نام نوٹ کر لئے۔ ان اعداد کی بنا پر میں نے ایک زبردست مضمون لکھا۔ اور ثابت کیا کہ چند ہی دن میں اس ہسپتال نے عوام کی وہ خدمت کر دکھائی ہے۔ جو دوسرے ہسپتال مہینوں میں نہیں کر سکتے۔ اور اس کامیابی کی وجہ ڈاکٹر ثریا کی قابلیت۔ مریضوں سے ان کا ہمدردانہ برتاؤ اور حسن انتظام کو قرار دیا۔ جب یہ مضمون چھپ گیا۔ تو میں نے اخبار کا ایک پرچہ ڈاکٹر ثریا کے ہسپتال آنے سے پہلے ان کی میز پر رکھ دیا اور خود دفتر میں جا بیٹھا۔

ڈاکٹر ثریا کو ہسپتال میں آئے پندرہ بیس منٹ نہ گزرے تھے کہ وہی مترنم آواز سنائی دی۔ "بشیرو" میں حسب دستور پنسل اور نوٹ بک لے کر حاضر ہو گیا۔ ڈاکٹر ثریا اخبار پڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے اخبار سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

"بشیرا اس دن اخبار "انسان" کا ایڈیٹر ٹیلیفون پر تم سے باتیں کر رہا تھا۔ کیا تم اس سے پوچھ سکتے ہو کہ ہمارے ہسپتال کے متعلق یہ مضمون کس نے لکھا ہے؟ کیا تم نے یہ مضمون پڑھا ہے؟"

میرے جواب کا انتظار کئے بغیر پھر بولیں۔

"جس کسی نے بھی یہ مضمون لکھا ہے۔ ہم پر بہت احسان کیا ہے میں کہتی ہوں مضمون بہت بلند ہے۔ اور اس نے بعض باتیں ایسی لکھی ہیں جو اسے بڑی مشکل سے معلوم ہوئی ہونگی۔ کیونکہ یہ باتیں صرف ہم ہی جانتے ہیں۔ اگر مضمون نگار نے مجھ سے مشورہ کیا ہوتا تو میں اسے اور باتیں بتاتی۔ بہرحال اس مضمون نگار کا پتہ لگانا ضروری ہے۔"

میں کچھ گھبرا سا گیا۔ کہ ڈاکٹر ثریا کو کیا جواب دوں۔ ڈاکٹر ثریا کا چہرہ خوشی کے مارے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بار بار اخبار کو دیکھتی تھیں آخر میں نے نظر زمین پر گاڑتے ہوئے کہا۔

"آپ اور ضروری باتیں فرما دیں۔ وہ سب شائع ہو جائیں گی۔"

ڈاکٹر ثریا نے نہایت بے تابی سے کہا۔

"بشیرا یہ مضمون تم نے لکھا ہے؟

اُن کی آواز میں تھرتھراہٹ سی تھی۔ مجھے جرأت نہ ہوئی کہ ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکوں۔

ڈاکٹر ثریا کرسی پر سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور دوسری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے اس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر ثریا میری افسر تھیں میں ان کے برابر کیونکر کرسی پر بیٹھ سکتا تھا؛ میں بغیر حرکت کئے کھڑا رہا انہوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر دھکیلا اور کرسی پر بٹھا دیا۔ میرے جسم میں ایک برقی رو دوڑ گئی۔ میں اپنے ماحول کو بالکل بھول گیا۔ تھوڑی دیر بعد نظر اٹھا کر سامنے دیکھا تو ڈاکٹر ثریا کے ماتھے پر پسینہ ہی پسینہ تھا۔ وہ اپنی اس غیر ارادی حرکت پر شرمندہ نظر آرہی تھیں۔ میں وہاں سے اٹھا۔ اور اپنی افسر سے اجازت لئے بغیر اپنے دفتر میں واپس آگیا۔

اس کے بعد میں نے تین چار مضمون لکھے جنہیں ڈاکٹر ثریا نے بہت پسند کیا۔ مگر اس پسندیدگی کا اظہار ان کے منہ نے نہیں۔ بلکہ آنکھوں نے کیا۔ جو ضروری باتیں ڈاکٹر ثریا نے بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ نہ مجھے پوچھنے کی جرأت ہوئی۔ اور نہ انہوں نے خود بتائیں۔

ایک رات مجھے بخار کی ہلکی سی حرارت ہو گئی۔ صبح میں اسی حالت میں دفتر چلا گیا۔ ڈاکٹر ثریا سے اپنی علالت کے متعلق عرض کیا۔ انہوں نے اچھی طرح سے میرا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

"معدہ کی خرابی ہے۔ تم نے ضرور بیوقت کھانا کھایا ہوگا۔ تم اپنی

دیکھ بھال خود نہیں کر سکتے۔ میں پوچھتی ہوں تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔"

پھر وہ خود ہی جھینپ گئیں اور ذرا دور جا کر نرس کو ہدایات دینے لگیں کہ وہ میرے لئے ایک مکسچر تیار کر لائے۔

میں نے مکسچر پیتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر! میں شادی کیسے کر سکتا ہوں؟ میری تنخواہ ساٹھ روپے ہے۔ یہ تنخواہ مجھ اکیلے کی کفیل نہیں ہو سکتی۔ اگر شادی کر لوں تو ایک اور نیک بخت کو میرے ساتھ فاقے برداشت کرنے پڑیں گے۔"

ڈاکٹر ثریا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا

"تم بہت پُراسرار آدمی ہو۔ شادی میں انسان کو جلدی نہیں کرنی چاہیئے۔"

میں ان کا مطلب نہ سمجھ سکا۔

دوسری چوٹ

ادشا سے ملاقات کے بعد میں بڑی بے تابی سے اشرف کا انتظار کر رہا تھا۔ اشرف نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ سوچے گا۔ میں سپرنٹنڈنٹ کس طرح بن سکتا ہوں۔ ادشا سے مدد نہ لینے کا میں نے فیصلہ کر

لیا تھا۔ دوسرا کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا۔ جسے میں بروئے کار لا سکتا۔ اب ساری امید اشرف سے وابستہ تھی۔ آخر اشرف ملا اور میرے مکان پر ملا۔ میں نے بہت کچھ سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ میں اوشا سے اپنی ملاقات کے متعلق اشرف کو ابھی نہیں بتاؤں گا۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے اُسے یہی پوچھا کہ میرے سپرنٹنڈنٹ بننے کے متعلق اس نے کیا سوچا ہے اس نے ایک چٹھی میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"یہ چٹھی سیکرٹری کے پرسنل اسسٹنٹ کے نام ہے۔ پرسنل اسسٹنٹ کے گہرے دوست مسٹر ورما نے اس چٹھی میں آپ کی سفارش کی ہے۔ آپ جب چاہیں دفتر میں جا کر پرسنل اسسٹنٹ سے مل سکتے ہیں۔ وہ آپ کو صحیح مشورہ دے گا۔ اور اگر ضرورت ہوئی تو آپ کی سیکرٹری سے ملاقات بھی کرا دے گا۔ آپ سارا معاملہ اس سے کہہ دیجئے۔ پھر اس کا ذمہ۔ مسٹر ورما اور پرسنل اسسٹنٹ اکٹھے کھاتے پیتے ہیں۔"

اشرف سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے یقین دلایا کہ مجھے کسی محکمہ کا سیکرٹری ہونا چاہئے تھا۔ وہ کرید کرید کر میرے ذاتی حالات دریافت کرتا رہا۔ اور میں بے تکلف بیان کرتا رہا۔ میں نے بھی اس کے حالات دریافت کرنے چاہے۔ وہ اپنے متعلق بڑے اختصار سے جواب دیتا رہا۔ مجھے صرف یہی معلوم ہو سکا کہ وہ ایک کاروباری آدمی ہے۔ اور امیر ہے۔ اس کی دو باتوں پر

مجھے کچھ تعجب سا ہوا۔ ایک یہ کہ اس نے اپنے کئی دوستوں کے نام لئے جو اس کے بیان کے مطابق لاکھ پتی اور حکومت سے خطاب یافتہ تھے۔ میں ریاض آباد کئی سال رہ چکا تھا۔ مگران ناموں میں سے ایک نام بھی میں نے نہیں سنا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اشرف نے اپنے ان دوستوں کی فیاضی اور دریا دلی کے واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کئے۔ اور ہر واقعہ کی تفصیل اس طرح ختم کی کہ ایک دن اس نے فلاں خان بہادر سے از راہِ مزاح کہا وہ اپنے جیبوں کی تلاشی دے۔ تلاشی لینے پر دو سو کے کرنسی نوٹ برامد ہوئے۔ اشرف نے خان بہادر کو ملامت کی کہ ایک خان بہادر کی جیب میں صرف دو سو روپے نقد !ان روپوں سے اشرف نے ایک گھڑی خرید لی۔ یا یہ کہ فلاں چوہدری سے اشرف نے کہا کہ ایک دوست سخت تکلیف میں ہے۔ اس کی مدد کے لئے پانچ سو روپے درکار ہیں۔ اس پر چوہدری نے سات سو روپے کا چیک کاٹ کر اشرف کو دے دیا۔ اشرف نے ایک بھی ایسا واقعہ بیان نہ کیا۔ جس میں خود اس نے کسی کی مدد کی۔ یا کسی کو تلاشی دی ہو۔ اس کی وجہ میں یہ سمجھا کہ بعض لوگ اپنے دوستوں کی تعریفیں کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اپنی خوبی ظاہر کرنا نہیں چاہتے یہی حال اشرف کا ہوگا۔

میرے سارے حالات سننے کے بعد اشرف نے کہا۔

"اگر آپ سپرنٹنڈنٹ نہ بن سکیں تو میں سمجھتا ہوں آپ کو نوکری پر

لعنت بھیجنی چاہیئے۔ آپ کاروبار کریں۔ آپ کی قابلیت کے جوہر نہیں کھلے۔ جتنا روپیہ نوکری سے آپ سال بھر میں کما سکتے ہیں۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ کاروبار میں اتنا روپیہ آپ ہفتہ عشرہ میں پیدا کر سکتے ہیں۔ صرف محنت شرط ہے۔"

میں نے تشکر آمیز نظروں سے اشرف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کاروبار کے لیئے بہرحال سرمایہ کی ضرورت ہے۔ وہ میرے پاس موجود نہیں۔ زبانی جمع خرچ سے دنیا کا کوئی کاروبار نہیں چل سکتا۔"

اشرف بولا۔

"میں کاروبار کو خوب سمجھتا ہوں۔ روپیہ بھی خدا نے بہت دیا ہے۔ مجھے ہمیشہ سے یہ جستجو رہی ہے کہ کوئی مخلص دوست مل جائے۔ جو زندگی کی کشمکش میں میرا بازو بن سکے لیکن جس دوست کو آزمایا وہ دھوکے باز اور فریبی ثابت ہوا۔ میں آپ کے روبرو آپ کی تعریف نہیں کرتا۔ بلکہ یہ حقیقت ہے کہ میں نے آپ میں وہ دوست پا لیا ہے۔ جس کی مجھے برسوں سے تلاش تھی۔ میرا سرمایہ آپ کا سرمایہ ہے۔ اگر آپ کاروبار کرنا چاہیں۔ تو مجھ سے شرکت کیجئے۔ مجھے صرف نیک نیتی اور خلوص کی ضرورت ہے۔ وہ آپ میں موجود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کبھی مجھے فریب نہیں دیں گے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ سپرنٹنڈنٹ بننے کی کوشش کریں۔ اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو ملازمت ترک کر دیں۔"

مجھے اشرف کی گفتگو سے یک گونہ تقویت پہنچی۔ اور میں نے سمجھ
لیا کہ میرے دن پھرتے نظر آتے ہیں۔ پھر دل میں وہی پرانا شک پیدا
ہو گیا کہ اشرف مجھ میں کیوں دلچسپی لیتا ہے؟ آخر وہ میری طرف کیوں
متوجہ ہوا ہے؟ دو چار دفعہ سے زیادہ میری اس کی ملاقات نہیں ہوئی
وہ مجھے اتنے وسیع اور سودمند کاروبار میں شریک کرنے پر خود بخود
کیوں تیار ہو گیا ہے۔ بہت سوچا۔ ذہن پر زور دیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا
یہی فیصلہ کیا کہ دنیا کا کارخانہ اسی طرح چلتا ہے۔ دن آدمی کے خراب آیا
تو سب اچھا ہی ہوتا ہے۔ یہ میری قسمت کی یاوری ہے کہ اشرف جیسا دوست
مجھے مل گیا۔ اب میں کچھ سے کچھ بن جاؤں گا۔

دوسرے دن میں نے ڈاکٹر ثریا سے آدھے دن کی رخصت لے
لی۔ اور سکرٹریٹ میں پہنچا۔ سیکرٹری کے پرسنل اسسٹنٹ سے
ملا۔ آداب بجا لانے کے بعد مسٹر ورما کی چٹھی دی۔ اس نے چٹھی کو
پڑھ کر عینک کے اوپر سے گھور کر میری طرف دیکھا اور کرسی پر بیٹھنے کو کہا
کہنے لگا۔

"اتفاق سے اس وقت مجھے چند منٹ کی فرصت ہے۔ آپ جو
کہنا چاہتے ہیں۔ جلد کہہ دیجئے۔ پتہ نہیں سیکرٹری صاحب کسی
وقت مجھے اپنے کمرہ میں بلا لیں۔ یہ سامنے ان کا کمرہ ہے۔"

میں نے اختصار کے ساتھ اپنے حالات بیان کئے۔ اور چار دفعہ
ہیڈ کلرکی سے محروم رہنے کے واقعات تک اپنی زبان کو محدود رکھا

تاکہ اس بارہ میں پرسنل اسسٹنٹ کی رائے معلوم ہو تو سپرنٹنڈنٹ بننے کے لئے مدد کی درخواست کروں۔ اس نے میری سرگزشت سن کر کہا۔

"ہیڈ کلرکی کا معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ ورما میرا گہرا دوست ہے۔ اس سے میرے تعلقات مجبور کر رہے ہیں کہ آپ کو صحیح اطلاع دے دوں۔ ورنہ یہ باتیں صیغہ راز میں رکھی جاتی ہیں۔ میں آپ پر بھروسہ کرتا ہوں۔ آپ میری اس گفتگو کا ذکر کہیں نہ کریں۔ جو میں انکشاف کرنے لگا ہوں۔"

میں نے اسے یقین دلایا کہ میں اتنا احسان فراموش نہیں ہوں کہ اس کی کہی ہوئی باتیں جو خود میرے فائدہ کے لئے ہیں دوسروں کو بتاتا پھروں۔

اس نے کہنا شروع کیا۔

"دراصل سپرنٹنڈنٹ اپنے بھتیجے کو ہیڈ کلرک بنانے کی سفارش کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس کے بھتیجے کا دفتری تجربہ بہت تھوڑا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ چاہتا ہے کہ ابھی سال چھ مہینے ہیڈ کلرکی کا فیصلہ نہ ہو۔ تاکہ وہ اپنے بھتیجے کے حق میں کیس بنا سکے۔ ہمارے سیکرٹری صاحب کا اپنا بھانجا بیکار ہے۔ بی۔ اے کے امتحان میں وہ تین مرتبہ فیل ہو چکا ہے۔ بی۔ اے فیل ہونے کی وجہ سے اُسے کوئی بڑی آسامی نہیں مل سکتی۔ سیکرٹری نے فیصلہ کیا ہے کہ اُسے براہِ راست

ہیڈ کلرک بنا دیا جائے۔ سپرنٹنڈنٹ کا بھتیجا اب ہیڈ کلرک نہیں بن سکتا۔ مگر افسوس آپ کے لئے کوئی موقع نہیں۔ اگر خود سیکرٹری اپنے بھانجے کی فکر میں نہ ہوتے تو میں لازمی طور پر سیکرٹری صاحب سے آپ کے متعلق عرض کرتا۔"

میں سپرنٹنڈنٹ بننے کا خیال بھول چکا تھا۔ مایوس ہو کر میں نے پوچھا۔

"کوئی امکانی صورت موجود ہے کہ سیکرٹری صاحب کو مجھے ہیڈ کلرکی دینے پر آمادہ کیا جا سکے۔ وہ بارسوخ اور صاحب اختیار آدمی ہیں۔ اپنے بھانجے کے لئے کوئی اور اسامی پیدا کر سکتے ہیں۔"

پرسنل اسسٹنٹ نے خوشی کا نسیں کھاتے ہوئے کہا۔

"دنیا میں ناممکن کوئی بات نہیں۔ ناممکن کا لفظ صرف بیوقوفوں کی لغت میں ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ ہر آدمی ہر کام نہیں کر سکتا۔"

میں نے امید کی جھلک دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ ارشاد فرمائیے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

"ہمارے سیکرٹری صاحب ذرا رنگین مزاج ہیں۔ اگر ڈاکٹر ثریا ان کے مکان پر جا کر آپ کی سفارش کرے تو وہ ضرور مان جائیں گے ایک بھانجا کیا دہ دس بھانجوں کی بھی پروا نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ انہیں مدد پر مائل کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ میرا خیال ہے آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔"

پرسنل اسسٹنٹ نے جو کچھ کہا۔ میں وہ سمجھ گیا اور جو کچھ اس نے نہ کہا وہ بھی میری سمجھ میں آ گیا۔ اس کے ان الفاظ نے مجھے سر سے لے کر پاؤں تک آگ لگا دی۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ رگوں میں بجلیاں دوڑنے لگیں۔ میں چاہتا تھا سیکرٹری سامنے آئے تو اُسے کچا چبا جاؤں۔ ڈاکٹر ثریا اور اس کمینے آدمی کے مکان پر ایک کلرک کی سفارش کرنے جائے۔ پتہ نہیں اس کم ظرف نے ڈاکٹر ثریا کو کیا سمجھا ہے۔ میں نے غصہ میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے آستینیں چڑھا لیں اور قریب تھا کہ پرسنل اسسٹنٹ کے جبڑے اکھاڑ کر رکھ دیتا کہ مجھے اپنی حیثیت یاد آ گئی۔ میں ایک گدا کی حیثیت سے سفارش کی بھیک مانگنے آیا تھا۔ میں نے کاسۂ گدائی صاحب خانہ کے سامنے رکھا۔ اس نے کاسۂ گدائی کو میرے منہ پر دے مارا۔ اب قصور وار کون تھا، میں یا وہ؟ دنیا یقیناً مجھے ہی مجرم قرار دیتی۔ میں خود پرسنل اسسٹنٹ کے پاس آیا تھا۔ اس نے مجھے نہیں بلایا تھا۔ میں نے اس سے مدد مانگی تھی۔ جو کچھ اس نے دیا۔ بہرحال وہ ایک گدا کے لئے تھا۔

یہ وہ سیکرٹری تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ایک انقلاب پسند آدمی ہے۔ پتہ نہیں کب ملازمت ترک کر کے ملکی تحریک میں شامل ہو جائے۔

میں نے پرسنل اسسٹنٹ سے کہا۔

"دیکھو مسٹر! تمہارا سیکرٹری اس قابل نہیں کہ وہ سیکرٹری کی کرسی پہ بیٹھ سکے۔ اگر اس کا یہی انصاف ہے کہ جو مظلوم فریاد لے کر آئے۔ اس سے اس قسم کی رشوت طلب کرے۔ جو مجھ سے طلب کی ہے تو یاد رکھو کہ قدرت اس سے انتقام لئے بغیر نہیں رہے گی۔ سیکرٹری کا اپنا گھر ایک دن آوارگی کا مرکز بنے گا۔ مجھے ہیڈ کلرک یا سپرنٹنڈنٹ بننے کی خواہش نہیں۔ میں سیکرٹری بنوں گا۔ اور محکمہ کو اخلاق سوزی سے پاک کروں گا۔ تم نے ڈاکٹر ثریا کی وہ توہین کی ہے جس کا کوئی کفارہ نہیں۔ تم سے اور تمہارے سیکرٹری سے بدلہ لینا آج سے میری زندگی کا اہم مقصد ہو گا۔ میں بدلہ میں دیر کرتا جاؤں گا حتیٰ کہ میں اس قابل ہو جاؤں کہ تم دونوں کی بوٹیاں نوچ کر کتوں کے سامنے پھینک سکوں۔ میں جاتا ہوں۔ آداب عرض!"

پرسنل اسسٹنٹ کے ہونٹوں پر حقارت آمیز ہنسی کھیل رہی تھی۔ اس نے مجھے ادھ جی دلوانہ بنا دیا۔ پرسنل اسسٹنٹ نے طنزیہ کہا۔

"تم سیکرٹری کے دفتر میں آ کر بھول گئے ہو کہ تم صرف ایک کلرک ہو . . . ."

مجھ میں زیادہ برداشت کی طاقت نہ تھی۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سیکرٹریٹ سے باہر آ گیا۔ راستہ میں رہ رہ کر مجھے اپنی بزدلی پر غصہ آ رہا تھا۔ کہ میں نے پرسنل اسسٹنٹ

کو زندہ کیوں رہنے دیا۔ مجھ سے وہ جاہل لوگ ہی اچھے جو عزت و ناموس پر کٹ مرتے ہیں۔ کیا یہ میرے بی۔ اے پاس ہونے کا اثر ہے کہ میری غیرت مصلحت سے بدل گئی ہے۔ یا ۱۲، ۱۳ سال کلرک بنے رہنے سے دل میں سوائے افسروں کی خوشامد کے کوئی دوسرا جذبہ باقی نہیں رہا۔
میں اسی طرح پیچ و تاب کھاتا اور اپنے لہو کی آگ میں جلتا ہوا گھر پہنچا۔ دیر تک سر چکراتا اور دل پر ایک خاص قسم کا بوجھ محسوس ہوتا رہا۔ کھانا زہر مار کیا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی سو گیا۔
سو کر اٹھا تو طبیعت بہت ہلکی ہو چکی تھی اور دماغ کو سکون تھا سیکرٹریٹ میں جو واقعہ پیش آچکا تھا۔ اس پر نظر ثانی کی میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔
"بشیر! یہ کیا بات ہے؟ ڈاکٹر ثریا کے نام پر تجھے اتنا غصہ کیوں آیا۔ تیرا اس کا تعلق صرف یہ ہے کہ وہ افسر ہے تو ماتحت۔ آخر سپرنٹنڈنٹ بھی تیرا افسر تھا۔ ہیڈ کلرکی کا جھگڑا تو ابھی کل کی پیداوار ہے۔ اس سے پہلے جبکہ تو اس کا نیازمند تھا۔ کوئی اسے گولی بھی مار دیتا۔ تو تجھے اتنا طیش نہ آتا۔ ڈاکٹر ثریا کے نام پر تیری رگ حمیت اس جوش سے کیوں پھڑکی ہے؟"
میں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکا۔ صرف جھینپ کر رہ گیا۔
میں نے اپنے متعلق ٹھنڈے دل سے غور کیا۔ اشرف نے بارہا یقین دلایا ہے۔ کہ قابلیت کے اعتبار سے میں سیکرٹری

بن سکتا ہوں۔ اوشا سمجھتی ہے۔ کہ مجھے محکمہ کا سیکرٹری ہونا چاہیئے۔ ڈاکٹر ثریا مجھے "پُراسرار" آدمی کہتی ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے۔ کہ میں اتنا قابل ہونے کے باوجود کلرکی پر مطمئن کیوں ہوں۔ مجھے جاننے والے اور مجھ سے بہتر پوزیشن کے افراد مجھے سیکرٹری کی آسامی کا اہل سمجھتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ میں سیکرٹری نہیں؟ ہوسکتا ہے کہ انسان اپنے متعلق رائے قائم کرنے میں مبالغہ سے کام لے۔ مگر اپنے متعلق ہ میری ہی رائے نہیں۔ یہ دوسرے لوگوں کی رائے ہے۔ انہیں کیا ضرورت ہے۔ میرے متعلق غلط رائے کا اظہار کریں۔ وہ میرے ماتحت نہیں نہ انہیں میری خوشامد سے کچھ حاصل ہوسکتا ہے۔ پھر ان کی رائے کیونکر غلط قرار دی جائے۔ مجھے سیکرٹری بننا چاہیئے مجھے سیکرٹری بننا پڑے گا۔

امّید کا مرکز

اوشا سے ملاقات کے بعد میں اپنے دوست ایڈیٹر "انسان" سے ملا۔ اوشا سے جو ملاقات ہوئی تھی اس کی تفصیل بیان کی۔ سب کچھ بتانے کے بعد میں نے بڑے انکسار سے کہا۔

"اوشا سے میری ملاقات ایک خدا ساز بات تھی

آپ سے پوشیدہ نہیں کہ میں ایک کلرک ہوں۔ اوشا مجھے اخبار نویس سمجھتی ہے۔ میں نے اس کے اس خیال کی تردید نہیں کی۔ میں اسے اسی لاعلمی میں رکھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری مدد نہیں کریں گے۔ میری زندگی کو کامیاب بنانے میں آپ میرا ساتھ نہیں دیں گے؟ آپ میرے دوست ہیں۔ مجھے آپ سے بہت سی توقعات ہونی چاہیئے۔ میں چاہتا ہوں آپ میرے سارے مضامین اپنے اخبار میں درج کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ میں جانتا ہوں۔ میرے دو چار مضمون چھاپنے میں آپ کو عذر نہ ہوگا۔ لیکن ممکن ہے مجھے مضامین کا ایک لمبا سلسلہ شروع کرنا پڑے۔ آپ میرے سارے مضامین کو اپنے اخبار میں جگہ دیں۔ میرا یہ اقدام ایک مخلصانہ خدمت ہے۔ آپ خود ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ میری اس ملکی خدمت کو آپ سے بڑھ کر کون سمجھ سکتا ہے؟"

میرے دوست نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرا اخبار آپ کا اپنا اخبار ہے۔ آپ جس طرح چاہیں۔ اسے استعمال کریں۔ ملک کی خدمت بھی کریں اور اوشا کا پروپیگنڈا بھی جتنا چاہیں کریں۔ میں جانتا ہوں۔ آخر اوشا آپ سے سول میرج کرلے اور آپ کا ملکی خدمت کا جنون ختم ہو جائے۔ اوشا بھی پاگل ہے اور آپ بھی پاگل ہیں آپ دونوں کا جوڑ خوب رہے گا۔ میں آپ دونوں کا فوٹو شائع کردوں گا۔

میں نے جواب دیا۔

" مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانا اسی کو کہتے ہیں۔ آپ کے مذاق سلیم کی داد نہیں دی جا سکتی۔ کیا خوب تناسب سوچا ہے آپ نے بہر حال میری درخواست قبول کرنے پر شکریہ!"

میں نے وہیں بیٹھ کر "مشہور لیڈر اوشا دیوی سے ایک زمیندار نوجوان کا انٹرویو" کے عنوان سے ایک نہایت ٹھوس مضمون لکھا۔ اس میں اوشا دیوی سے اپنی ملاقات کی پوری تفصیل دی۔ اس کے خیالات پر تبصرہ کیا۔ اپنے اعتراضات کی صراحت کی اور اخیر میں اوشا کو بعض مشورے دیئے۔ میرے مضمون کا لہجہ بتاتا تھا کہ اوشا ایک بہت بڑی لیڈر ہے۔ اور ملک کی تمام آئندہ امیدیں اسی سے وابستہ ہیں۔ میں نے ایڈیٹر سے کہہ دیا کہ میں سرکاری ملازم ہوں۔ اپنے نام پر ایسے مضامین شائع نہیں کر سکتا۔ میرا یہ مضمون "ایک زمیندار کے قلم سے" کے ماتحت شائع کر دیا جائے۔

میرا مضمون چھپ گیا۔ ایڈیٹر نے اپنی طرف سے اس پر لیڈر لکھ کر مضمون کی اہمیت کئی گنا بڑھا دی۔ میں نے بڑی بے تابی سے لیڈر کو پڑھا۔ کہ کہیں کوئی بات اوشا کی شان کے خلاف نہ ہو۔ مگر ایڈیٹر نے بڑی سنجیدگی سے نوجوان تحریک کا تجزیہ کیا تھا۔ اور اس کے لفظ لفظ سے اوشا کا احترام مترشح تھا۔ میں بہت خوش ہوا کہ اوشا کی تقریر کے بعد یہ مضامین نوجوان تحریک کو مستقل بنانے کی

طرف پہلا قدم ہونگے ۔

دوسرے دن اخبار "انسان" کے دفتر سے چپڑاسی میرے نام ایک لفافہ لایا۔ میں نے پتہ پڑھا۔ اندازِ تحریر غیر معروف تھا۔ خط کو کھول کر دیکھا لکھا تھا۔

۶۸ کننگسلے روڈ

ریاض آباد

مکرمی تسلیم!

اخبار "انسان" میں آپ کا مضمون پڑھا۔ اور اسی اشاعت کا ایڈیٹوریل بھی نظر سے گزرا جس لہجہ میں آپ نے نوجوان تحریک اور میرے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے لئے میرا شکریہ قبول کیجئے مجھے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ کسی وقت فرصت ہو۔ تو تشریف لائیے۔ جس وقت آپ کا دل چاہے آجایئے۔ میں ہر وقت مل سکوں گی۔

اوشا

یہ خط میں نے کئی بار پڑھا۔ کبھی اُسے کوٹ کے جیب میں رکھا کبھی قمیض کے جیب میں۔ پھر اسے میز کے دراز میں دھرا۔ وہاں سے اٹھا کر پتلون کی جیب میں ڈالا۔ پھر اسے کوٹ کے جیب میں منتقل کیا۔ اور آخر اسے قمیض کے جیب میں رکھنا ہی مناسب سمجھا۔

اوشا سے میری پہلی ملاقات اگرچہ اوشا ہی کی خواہش پر ہوئی تھی۔ مگر اس کے پس پردہ خود میری کوشش کارفرما تھی۔ ملاقات

کی دعوت کا لہجہ بالکل کاروباری تھا۔ موجودہ خط اوشا کی طرف سے دوسرا دعوت نامہ تھا ۔ یہ بغیر میری تحریک کے لکھا گیا اور اس کا لہجہ کاروباری نہیں بلکہ اس میں ذاتی شوق کی جھلک بھی موجود تھی۔

دوسرے دن اتوار تھا۔ میں صبح نو بجے اوشا کے بنگلے پر پہنچ گیا میرا ملاقاتی کارڈ دیکھتے ہی اوشا خود ڈیوڑھی تک آئی ۔ اور مجھے اپنے ہمراہ ڈرائنگ روم میں لے گئی ۔ میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ مجھ سے مل کر خوشی سے لال ہو رہا تھا ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اسے دیکھ کر میری باچھیں بھی کھل رہی تھیں وہ خود پھلوں کا طشت اٹھا کر لائی اور چھری میرے سامنے رکھ کر مجھے پھل کھانے کو کہا ۔ یہاں کی بات تو یہ ہے کہ اول تو مجھے بھوک تھی ہی نہیں اگر کچھ تھی بھی تو وہ اوشا سے ملتے ہی دور ہو گئی ۔ پھر بھی اوشا کے اصرار پر میں نے کچھ نہ کچھ کھا لینا ہی مناسب سمجھا ۔ اوشا نے بڑے شوق سے کہا۔

" ہماری ایگزیکٹو کا اجلاس ایک ہفتہ تک ہونے والا ہے میں آپ کا نام انجمن کی جائنٹ سیکرٹری شپ کے لئے پیش کرنے والی ہوں ۔ پھر تو آپ کو ہم سے بن بلائے بھی ملنا پڑا کرے گا ۔ کیوں جناب جب تک ہم لکھ کر درخواست آپ کے حضور میں پیش نہ کریں آپ ادھر کا رخ نہیں کیا کریں گے ؟"

جائنٹ سیکرٹری شپ کا نام سن کر میرا رنگ اڑ گیا ۔ ایک سرکاری ملازم ایسی انجمن کا عہدیدار کیسے ہو سکتا ہے ۔ پھر سرکاری

ملازم بھی وہ کلرک، سپرنٹنڈنٹ جس کی جان کا لاگو ہو رہا ہے۔ اگر سپرنٹنڈنٹ کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو وہ مجھے قید کرانے سے دریغ نہیں کریگا میں نے معذرت کرتے ہوئے اوشا سے کہا۔

"میں انجمن کا خیر اندیش اور بہی خواہ ہوں۔ اپنی بساط کے مطابق اس کی خدمت کر رہا ہوں۔ آئندہ بھی مجھ سے جو کچھ ——— ہو سکے گا ضرور کروں گا۔ لیکن اس کا کوئی عہدہ قبول کرنا میرے لئے ناممکن ہے اس کی وجہ میرے ذاتی حالات ہیں۔ جن کی تفصیل اس وقت بیان کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

میں نے دیکھا کہ میرے اس بیان سے اوشا کے چہرہ سے گلاب کی سی شگفتگی یکسر کافور ہو گئی۔ اور اس پر گہری مایوسی چھا گئی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آپ اس لئے عہدہ قبول نہیں کرتے کہ انجمن کی صدر میں ہوں۔ آپ مسلمان ہیں اور میں غیر مسلم ہوں۔ مگر ہندو مسلم اتحاد تو اس انجمن کا اولین مقصد ہے۔ کیا آپ مجھ سے مل کر کام کرنا نہیں چاہتے آخر میرا ہندو ہونا آپ کے نزدیک قابل نفرت کیوں ہے؟"

اوشا کے یہ الفاظ میری قوت برداشت سے زیادہ تھے۔ میں اپنے دل کی انتہائی گہرائی سے اوشا کا احترام کرتا تھا۔ اگر میں سرکاری ملازم نہ ہوتا تو اوشا سے مل کر کام کرنے کو اپنی خوش قسمتی کی معراج سمجھتا۔ لیکن اب؟ کیا اوشا کی خاطر میں ملازمت سے استعفا دیدوں۔ مگر اس

صورت میں میرا گزارہ کیسے چلے گا۔ میں امیر نہیں۔ ایک مزدور آدمی ہوں۔ مزدوری نہ کروں گا تو کھاؤں گا کہاں سے اور ادھر اگر عہدہ قبول نہیں کرتا تو اوشا ناراض ہوتی ہے۔ یہ بھی مجھے گوارا نہیں۔

اوشا نے تھوڑے سے سکوت کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔

"ہمیں مفید اور قابل کارکنوں کی سخت ضرورت ہے۔ اگر آپ جیسے نوجوان میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تو ہماری انجمن کامیاب نہیں ہو سکیگی۔ اگر آپ کے خیال میں جائنٹ سیکرٹری کا عہدہ چھوٹا ہے۔ تو ہم آپ کو جنرل سیکرٹری بنا دیں گے۔ اس کے لئے ہمیں عہدیداروں کے دوبارہ انتخاب تک انتظار کرنا پڑیگا۔ اور وہ دو ایک مہینے تک ہونے والا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے التجا آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میری روح تک لرز گئی۔ اور مجھے بیحد صدمہ ہوا۔ میں نے پھر کہا۔

"میں عرض کر چکا ہوں کہ میرے راستہ میں میری فلاں وجوہ حائل ہیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں وجوہ کو جلد از جلد دور کرنے کی کوشش کرونگا آپ کا ہندو ہونا قطعاً میرے راستہ میں حائل نہیں۔ آپ کے ان الفاظ سے مجھے سخت تکلیف ہوئی ہے۔ کیا اس انجمن کی حمایت میں مضامین لکھتے وقت مجھے علم نہ تھا کہ آپ غیر مسلم ہیں۔ آپ کا مذہب خواہ کچھ ہو۔ آپ نیک نیتی سے ملک کی خدمت کر رہی ہیں۔ بحیثیت ایک ادنیٰ محب وطن ہونے کے میرا فرض ہے کہ آپ کے نائب کی حیثیت

سے کام کروں ۔ میری درخواست ہے کہ آپ مجھے عہدہ قبول کرنے پر مجبور نہ کریں ۔ ویسے پریس پروپیگنڈا کا کام میرے سپرد کریں ۔ میں آپ کی صرف یہی خدمت کر سکتا ہوں ۔ سو یہ کرتا رہونگا ۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ جلد جلد آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کرتا رہونگا

آہستہ آہستہ ادشا کے چہرہ پر پھر بشاشت نظر آنے لگی ۔ ابھی تک خاموش تھی ۔ اسے میں کس طرح اپنی نیازمندی کا یقین دلاتا ۔ اس کا وہم کیسے دور کرتا ؟ فوراً میرے ذہن میں ایک تجویز آئی میں مطمئن ہو گیا میں نے ادشا سے مخاطب ہو کر کہا ۔

"مجھے ایک معاملہ میں آپ کی مدد درکار ہے۔"

"کہیئے !

ادشا بولی ۔

میں نے کہا ۔

"میرا ایک دوست دفتر انسپکٹر جنرل شفاخانہ جات میں ملازم ہے ۔ وہ وزیر اعظم سے ملنا چاہتا ہے ۔ اس کا محکمہ وزیر اعظم ہی کے ماتحت ہے ۔ اسے اپنے افسروں سے کچھ شکایت ہے ۔ وہ براہِ راست وزیر اعظم سے گفتگو کرنی چاہتا ہے ۔ کیا ہماری انجمن اس کی مدد کر سکتی ہے ؟ وہ میرا بڑا عزیز دوست ہے ۔ میں اس کی پریشانی نہیں دیکھ سکتا۔"

ادشا کا چہرہ خوشی سے پھر چمک اٹھا ۔ وہ بولی ۔

"موجودہ وزارت کی پالیسی ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے ۔

اس پالیسی کی اصلاح ممکن نہیں۔ اسمبلی کے آئندہ انتخاب میں ہمیں موجودہ وزراء کو قلمدانِ وزارت سے علیحدہ کرنا پڑے گا۔ لیکن ذاتی طور پر وزیر اعظم میرے والد کے گہرے دوست ہیں۔ وہ مجھے بھی بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں خود آپ کو ان کے نام چٹھی لکھ دوں گی۔ کہئے آپ کے دوست کا کیا نام ہے؟"

میں نے جواب دیا۔

" چٹھی میں میرے دوست کا نام ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں آپ صرف یہ لکھ دیں کہ وہ خط لے جانے والے کی بات سن لیں۔ اور اس کی مدد کریں۔"

ادشا ڈرائنگ روم سے غائب ہو گئی اور دس منٹ کے بعد واپس آئی۔ وزیر اعظم کے نام مجھے چٹھی پکڑاتے ہوئے بولی۔

" اپنے دوست سے کہیں وہ وزیر اعظم سے جلدی مل لیں۔"

میں نے ادشا کا شکریہ ادا کیا۔ اب ادشا کا چہرہ خوشی کے مارے پھر سرخ ہو رہا تھا۔ میرا اس سے مدد مانگنا اس بات کا ثبوت تھا۔ کہ میرے دل میں اس سے مدد لینے اور مدد دینے کا پورا شوق ہے۔

ادشا نے ازراہ مذاق مجھ سے پوچھا۔

" زمیندار آپ کب سے بن گئے؟ مضمون پر لکھا تھا۔ ایک زمیندار نوجوان کے قلم سے" کیا آپ واقعی زمیندار ہیں؟"

میں نے بتایا کہ میں درحقیقت زمیندار ہوں۔ اور گاؤں کا رہنے

والا ہوں۔ پھر ازراہِ مزاح کہا۔

"میں ایک دیہاتی ہوں۔ اور شہری لوگ لفظ "دیہاتی" کو گالی سمجھتے ہیں تاہم اگر آپ مجھے "دیہاتی" کہہ کر بلائیں تو میں اسے ناپسند نہیں کروں گا۔"

ادشا ہنسی اور کہنے لگی۔

"ہمارے صوبہ کی نوّے فیصدی آبادی دیہاتی ہے۔ ہماری انجمن کا اصل کام دیہات میں ہے۔ سارے شہروں کو منظم کر لینے سے بھی صرف دس فیصدی کام ہو سکتا ہے۔ جب تک دیہات میں ہماری انجمن کی شاخیں قائم نہ ہوں۔ ہماری کامیابی ادھوری رہے گی۔ آپ دیہات میں بھی انجمن کا پروپیگنڈا کریں۔"

میں نے وعدہ کیا کہ ادشا کے حکم کی ضرور تعمیل کرونگا۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے انجمن کے مطبوعہ اغراض و مقاصد کی دو اڑھائی سو کاپیاں ادشا سے لے لیں۔ اور اس سے جلدی دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا۔

ادشا سے میری پہلی ملاقات اور اس دوسری ملاقات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اب ادشا کو شکایت ہے کہ میں اس سے جلدی جلدی نہیں ملتا۔ وہ مجھے اپنا سیکرٹری بنانا چاہتی ہے۔ مگر میری کلرکی اس کے راستہ میں حائل ہے۔ مجھ سے مل کر ادشا کو کتنی خوشی ہوتی ہے کیا اور لوگوں سے مل کر بھی ادشا کا چہرہ خوشی سے اسی طرح کھل جاتا

ہوگا۔ اسی قسم کے خیالات یکے بعد دیگرے گزرتے رہے۔ اور میں چلتا گیا
گھر پہنچکر میں نے انجمن کے اغراض و مقاصد کو غور سے پڑھا۔ پھر حافظہ
پر زور دیا کہ صوبہ کے کس کس گاؤں میں میرے عزیز رشتہ دار اور دوست
ہیں۔ ان کی ایک فہرست بنائی۔ سالہا سال سے میرے اور ان لوگوں
کے درمیان کوئی تعلقات نہ تھے۔ میری دنیا سمٹ کر دفتر کے کمرہ میں آ
گئی تھی۔ برسوں میں نے اس کمرہ سے جھانک کر بھی باہر نہ دیکھا تھا۔ اب
یکایک ان سب متعلقین کو اپنے اپنے گاؤں میں انجمن کی شاخیں بنانے
کے لئے لکھوں تو وہ مجھے پاگل ہی سمجھیں گے۔ مگر اوشا کے حکم کی تکمیل بھی
ضروری ہے۔ صوبہ کے دیہات میں انجمن کی سو پچاس شاخیں قائم ہو گئیں
تو اوشا بہت خوش ہوگی۔ اور اس کی خوشی میری خوشی ہے۔ اسے خوش
دیکھ کر میں خود بخود ہی خوش ہو جاتا ہوں۔

بڑی سوچ بچار کے بعد میں نے خط کا مضمون ترتیب دیا۔ اس
میں پہلے اپنا پورا تعارف کرایا۔ پھر گذشتہ چند سال کے اپنے
واقعات بیان کئے۔ اس کے بعد ریاض آباد میں نوجوانوں کی بیداری
کا حال درج کیا۔ اور آخر میں درخواست کی کہ مکتوب الیہ اپنے گاؤں
کی شاخ قائم کرے اور اس کی اطلاع مجھے کردے۔ ہر دوست اور
رشتہ دار کے لئے میں نے ایک ہی مضمون تجویز کیا۔ کاغذ قلم لے
کر بیٹھا۔ اور خط کا مضمون نقل کرتا گیا۔ ہر خط میں انجمن کے اغراض و مقاصد
کی کاپی ملفوف کردی۔ شام تک تیس کے قریب خطوط ڈاک میں ڈال

دیئے گئے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ بہت جلد مجھے رخصت لے کر ان تمام دیہات میں ایک مرتبہ ضرور جانا چاہیئے۔ تاکہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے تعلقات نئے سرے سے استوار ہو جائیں اور تنظیم زیادہ مؤثر طریق پر ہو سکے۔ اور انہیں ترغیب دی جائے کہ وہ اپنے ذاتی رسوخ سے کام لے کر باقی دیہات میں بھی انجمن کی شاخیں قائم کریں۔ میں نے اندازہ کیا کہ صوبہ میں کم از کم ایک ہزار شاخ قائم ہونی ضروری ہیں۔ تاکہ ریاض آباد میں انجمن جو فیصلہ کرے وہ فوراً ہی صوبہ کے کونہ کونہ میں پہنچ جائے میں نے خط میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ دیہات میں حکام کے خلاف اگر کوئی شکایت ہو تو مرکزی انجمن کو لکھ دیں تاکہ یہاں اس کا تدارک کیا جائے۔ مجھے یقین تھا کہ میرے یہ الفاظ دیہات میں انجمن کے متعلق اور زیادہ دلچسپی پیدا کریں گے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے وزیر اعظم سے ملاقات کے متعلق سوچا۔ میں نے خیال کیا کہ جتنی جلدی ہو سکے وزیر اعظم سے مل کر اپنے لئے کوئی فیصلہ صادر کرا لینا چاہیئے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ وزیر اعظم ایک ہندوستانی ہے۔ وہ اپنے بھائیوں کی ذہنیت کو انگریز کی نسبت زیادہ اچھی طرح سمجھتا ہو گا۔ جونہی محکمہ کی بدعنوانیوں کی طرف میں نے توجہ دلائی۔ وہ اپنے اختیارات سے کام لے کر سب معاملات درست کر دیگا۔

میں گذشتہ ہفتہ کچھ علیل رہا تھا۔ ایک روز نصف دن کی چھٹی

بھی لے چکا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ وزیر اعظم سے ملنے کا بہترین وقت قبل از دوپہر ہے۔ اس دم اس کا دماغ تازہ ہوگا۔ اور وہ تفصیل کے ساتھ میرے معاملہ پر غور کر سکے گا۔ چنانچہ دفتر جاتے ہی میں نے ڈاکٹر ثریا سے عرض کیا مجھے اپنا سامان گھر سے ہسپتال کے کوارٹر میں منتقل کرنا ہے۔ اگر وہ دس بجے مجھے رخصت دے دیں تو ان کی مہربانی ہوگی۔ میرا خیال تھا۔ کہ وہ کہیں گی کہ ابھی کل ہی تو اتوار تھا۔ تم نے اتوار کو سامان کیوں نہ منتقل کر لیا۔ مگر ڈاکٹر ثریا پھر ڈاکٹر ثریا تھیں انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے مجھے اجازت دیدی۔ میں نے طے کر لیا کہ گیارہ بجے کے قریب وزیر اعظم سے مل لوں گا۔ اور شام کو اپنا سامان کوارٹر میں لے آؤں گا۔ تاکہ ڈاکٹر ثریا کو اعتراض کا موقعہ نہ ملے۔

دفتر سے نکل کر چلتے چلتے میں نے پھر اپنے خیالات کو ترتیب دینا شروع کیا۔ مجھے اپنا معاملہ عجیب معلوم ہو رہا تھا۔
کسی چیز کو حاصل کرنے کی خواہش رکھنا اور بات ہے۔ لیکن واقعات کا اس خواہش کی تائید کرنا قطعی طور پر اور بات ہے۔ جہاں تک ہیڈ کلرکی کا تعلق تھا مجھ سے بے انصافی ہوئی اور چار مرتبہ کھلے بندوں ہوئی۔ جہاں تک واقعات کا تعلق تھا۔ میں ہیڈ کلرکی کے لئے جتنا چیختا بجا تھا۔ لیکن اس سے آگے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کی اسامی کی خواہش میرے دل میں محض اس لئے پیدا ہوئی کہ میں دیانتداری سے سمجھتا تھا

ہیں بلحاظ قابلیت کسی طرح بھی اپنے سپرنٹنڈنٹ سے کم نہیں ہوں لیکن ظاہر ہے کہ میرا یہ خیال کتنا ہی دیانتدارانہ کیوں نہ ہو میں اعلیٰ افسروں کے سامنے اسے بطور دلیل کے پیش نہیں کرسکتا تھا۔ اور دراصل معاملہ اس سے بھی ایک قدم آگے تھا۔ مجھے سیکرٹری بننا تھا۔ وہ اس لئے کہ محکمہ کا اخلاقی معیار بلند کیا جا سکے۔ اس عہدہ کے لئے میری خواہش کی دلیل میں ارشاد اور اشرف کی رائیں موجود تھیں۔ سوال یہ تھا کہ ان کی رائیں وزیر اعظم کے لئے بھی قابل قبول تھیں یا نہیں۔ یہ دلیل کہ لوگ مجھے سیکرٹری کے عہدہ کے قابل سمجھتے ہیں۔ کمزور نہ تھی۔ میں اسے استعمال کرسکتا تھا۔ آخر وزیر اعظم بھی تو اسی لئے وزیر اعظم تھا کہ لوگ اُسے وزیر اعظم جیسی اہم ذمّہ داری کے قابل سمجھتے تھے۔ اگر خود وزیر اعظم کی پوزیشن رائے عامہ کی مرہون منت ہے تو رائے عامہ کی بنا پر میرا سیکرٹری بننا کیوں مشکل تھا۔

میں گیارہ بجے وزیر اعظم کے دفتر میں پہنچ گیا۔ وزیر اعظم کے پرسنل اسسٹنٹ سے ملا۔ اور اسے ارشاد کی چٹھی دے کر کہا۔ وہ اس چٹھی کو وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کردے۔ ہر چند کہ چٹھی ذاتی تھی اور وزیر اعظم کے نام تھی۔ پرسنل اسسٹنٹ نے اسے کھول کر بے تکلف پڑھنا شروع کردیا۔ اور دو ایک مرتبہ چٹھی کے طول و عرض پر نظر دوڑا کر کہا۔

" وزیر اعظم صاحب بہت مصروف ہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ

آپ کو ملاقات کے لئے وقت دے سکیں۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہو مجھ سے کہہ دیجئے۔ میں مناسب موقع پر ان سے عرض کر دوں گا۔"

اس کے چٹھی کھول لینے پر میں احتجاج کرنے ہی کو تھا کہ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اب مجھے احتجاج بھول گیا۔ ساری توجہ ملاقات کے لئے موقع نکالنے پر مرکوز ہو گئی۔ میں نے اپنا گلا صاف کرنے کے بعد کہا۔

"یہ اوشا دیوی کی چٹھی ہے۔ اوشا دیوی رائے بہادر صاحب کی لڑکی ہیں۔ وزیر اعظم سے ان کے خاندانی تعلقات ہیں۔ انہیں تعلقات کے سلسلہ میں میری یہ ملاقات ہے۔ مجھے دو چار منٹ سے زیادہ بات نہیں کرنی۔ آپ مہربانی کر کے ابھی یہ چٹھی وزیر اعظم صاحب کو پہنچا دیں۔ میں یہاں انتظار کروں گا۔

میری اس درخواست پر پرسنل اسسٹنٹ اٹھا اور اوشا کی چٹھی ہاتھ میں لئے چق اٹھا کر وزیر اعظم کے کمرہ میں داخل ہو گیا۔ دو ایک منٹ کے بعد اس نے چق اٹھا کر باہر کی طرف جھانکا۔ اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں چند ہی سیکنڈ میں وزیر اعظم کے سامنے کھڑا تھا۔ پرسنل اسسٹنٹ واپس اپنی کرسی پر جا بیٹھا میں اور وزیر اعظم اکیلے رہ گئے۔ وزیر اعظم نے اپنے عین سامنے مجھے کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ اور اس سے اپنا تعارف کرایا کیونکہ مجھے معلوم تھا اوشا کی چٹھی میں میرا نام وغیرہ مرکوز نہ تھا۔ اس کے بعد

میں نے مختصر طور پر بتایا۔ کہ کس طرح مجھے چار مرتبہ ہیڈ کلرکی سے بغیر کسی وجہ کے محروم کر دیا گیا۔ حالانکہ مجھے اور اشرف کی رائے میں کسی محکمہ کا سیکرٹری ہونا چاہیئے۔

وزیر اعظم نے کہا۔

"تم نہیں جانتے کہ میری ذمہ داریاں کتنی بڑی ہیں۔ میں اگر ایسے معمولی معاملات میں دخل دینا شروع کر دوں تو صوبہ کا نظم ونسق دھرا کا دھرا رہ جائے۔ میرے صوبہ میں ہزارہا کلرک ہیں۔ تم خود ہی کہو۔ اگر میں ان کی شکایتیں سننے لگوں تو اور کوئی کام کر سکتا ہوں؟ اگر تم سے واقعی بے انصافی ہوئی ہے تو تم سیکرٹری سے اپیل کر سکتے ہو۔ وہ اس پر غور کرے گا۔"

میں نے عرض کیا۔

"اگر میں سرکاری طور پر اپیل کروں تو وہ قواعد کے مطابق بہر حال پہلے سپرنٹنڈنٹ کے پاس جائے گی۔ اور وہ اُسے سیکرٹری کے پاس بھیجے گا۔ لیکن جس صورت میں اپیل خود اسکے اپنے خلاف ہوگی وہ کیوں میری اپیل اوپر بھیجے گا؟ اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ میں نے سیکرٹری سے ملنے کے لئے سپرنٹنڈنٹ سے درخواست کی۔ جو اس نے فوراً رد کر دی۔ غیر سرکاری طور پر میں سیکرٹری سے بھی مل سکتا ہوں۔ بلکہ اس سلسلہ میں ایک دفعہ کوشش بھی کر چکا ہوں۔ سیکرٹری اخلاق باختہ آدمی ہے۔ وہ مجھ سے ایسی رشوت

مانگتا ہے۔ جس کا نام سننے سے خون کھولنے لگتا ہے۔"
وزیرِ اعظم نے گرج کر کہا۔
"میں اپنے سیکرٹری کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں۔"
میں نے اپنے آپ پر ضبط رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
"آپ ایک منٹ کے لیے میرا معاملہ بھول جائیں۔ فرض کیجیے۔ کسی اور ملازم کے معاملہ میں سپرنٹنڈنٹ اور سیکرٹری دونوں بے انصافی کرتے ہیں۔ اس ملازم کے لیے انصاف حاصل کرنے کا کونسا راستہ ہے۔"
وزیرِ اعظم نے ناراضگی کے لہجہ میں کہا۔
"بے انصافی کی ایسی مثالیں ہو سکتی ہیں۔ مگر بہت کم۔ کلرکوں کو یہاں آکر میرا وقت ضائع کرنے کی اجازت دینے کی بجائے میں یہ گوارا کر لوں گا کہ ان معدودے چند ملازموں سے بے انصافی ہو جائے۔ یہ انسانی نظام ہے۔ خدائی نظام نہیں۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں سیکرٹری کے معاملات میں دخل دوں۔ یہ سیکرٹری کا معاملہ ہے۔"
میں نے غصّہ میں آکر کہا۔
"کیا میں سمجھوں کہ مجھ پر انصاف کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ مجھے آپ کے ضروری اور غیر ضروری معاملات سے غرض نہیں۔ اگر

آپ مجھ سے انصاف نہیں کرتے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ خود بے انصافی کی حمایت کر رہے ہیں۔"

وزیر اعظم۔ "تم جو چاہو سمجھ سکتے ہو۔"

ہیں۔ "آپ بھولتے ہیں۔ آپ کی تنخواہ ہماری زمین کے لگان سے ادا ہوتی ہے۔ آپ ہمارے نوکر ہیں۔ نوکر اپنے آقاؤں کو یوں جواب نہیں دیا کرتے۔ آپ کا دبدبہ سب بجا۔ آپ کی شخصیت سے انکار نہیں۔ آپ کے اختیارات تسلیم ہیں لیکن وزیر اعظم کی حیثیت ایک مٹی کے بت سے زیادہ نہیں۔ جسے توڑ کر نیا بت بنایا جا سکتا ہے۔ اس بت کی پوجا کرنے والے کتنے ہی بلند مرتبہ لوگ سہی۔ اسے بنانے والے اور توڑنے والے معمولی حیثیت کے لوگ ہوتے ہیں۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے بنائے ہوئے موجودہ بت کو توڑنا پڑیگا۔"

وزیر اعظم۔ (حقارت آمیز مسکراہٹ سے) "میں تمہیں ہسپتال کے دفتر سے پاگل خانہ میں تبدیل کرا سکتا ہوں۔ کیا رائے ہے تمہاری؟"

ہیں۔ "میں ہسپتال کے دفتر سے پاگل خانہ میں تبدیل نہیں ہونگا بلکہ اس کمرہ میں منتقل ہو جاؤنگا جس میں اس وقت موجود ہوں۔ وہ سماں اس وقت میرے تصور میں ہے۔ جب میں وزیر اعظم ہونگا۔ اور آپ ملاقاتی کی حیثیت سے میرے سامنے بیٹھے ہونگے

گئے۔ میں سچ کہتا ہوں وزارت کی کرسی پر بیٹھ کر میں ہر محکمہ کا ڈھانچہ بدل ڈوں گا۔ میں حکم دوں گا کہ عوام کے ٹیکس اور لگان سے روٹی کھانے والے غیر منصف ملازموں کو سرِراہ ذلیل کیا جائے۔ خواہ وہ سپرنٹنڈنٹ ہوں یا سیکرٹری۔ میں ہر ملازم کو یہ احساس کرا دوں گا کہ وہ عوام کا دیوتا نہیں بلکہ داس ہے۔"

وزیرِ اعظم نے قہقہہ لگایا اور کہا۔

"تم اکیلے ہی وزیرِ اعظم بننے کے خواب دیکھ رہے ہو۔ میرے صنو میں ہزاروں نوجوان اپنے آپ کو مستقبل کے وزیرِ اعظم سمجھتے ہیں۔ میرا کام بے حد خشک اور صبر آزما ہے۔ جب میں اپنے کام سے اُکتا جاتا ہوں۔ تو تمہارے جیسا کوئی نہ کوئی پاگل اِدھر آنکلتا ہے اور طبیعت بہل جاتی ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

وزیرِ اعظم کے ان الفاظ سے میری خودداری کو سخت ٹھیس لگی۔ میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ سر چکرانے لگا۔ زمین گھومتی ہوئی معلوم ہوئی۔ دل پاش پاش ہو گیا۔ آنکھوں کے آگے تیلیاں سی ناچنے لگیں رگوں میں خون کی جگہ بجلیاں دوڑتی محسوس ہوئیں۔ اور جسم حرارت سے پھنکنے لگا۔ میں کب وزیرِ اعظم کے دفتر سے نکلا اور کیسے اپنے گھر پہنچا۔ اس کا مجھے قطعاً علم نہیں۔ جب مجھے ہوش آیا۔ تو میں نے اپنے آپ کو گھر میں اپنے بستر پر لیٹے پایا۔ میرے نوکر کے علاوہ ہسپتال کی ایک نرس بھی موجود تھی۔ میرے ماتھے پر پھاہا لگا ہوا تھا

اور مجھے بیحد کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھا۔ اور نوکر سے صورتِ حال دریافت کی۔ اس نے کہا۔

"کل دوپہر سے آپ کو شدید بخار ہے۔ آپ ہذیان میں بہت باتیں کرتے رہے ہیں۔ میں ڈر گیا تھا۔ دوڑا دوڑا ہسپتال گیا اور بڑی ڈاکٹر کو بتایا کہ ہمارے بابو جی کو کچھ ہو گیا ہے۔"

میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"تم نے ڈاکٹر ثریا کو بتا دیا، پھر کیا ہوا؟"

میں نے بدحواسی کے عالم میں نرس کی طرف دیکھا۔ نوکر نے جواب دیا۔

"بابو جی! بڑی ڈاکٹر صاحبہ بہت اچھی ہیں۔ وہ اسی وقت میرے ہمراہ یہاں آئیں۔"

میں نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ڈاکٹر ثریا یہاں آئی تھیں؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بابو جی! وہ یہاں آدھ گھنٹے سے زیادہ ٹھہری تھیں۔ انہوں نے آپ کو اچھی طرح سے دیکھا۔ پھر مجھے رقعہ لکھ کر دیا اور ہسپتال بھیجا۔ میں دوائی لایا اور ساتھ ہی نرس بھی آگئی۔ ڈاکٹر نے رقعہ میں لکھ دیا ہوگا۔ کہ نرس چلی آئے۔" نوکر نے تشریح کرتے ہوئے کہا۔

اب نرس سے نہ رہا گیا۔ بولی۔

"مسٹر بشیر! ڈاکٹر ثریا کی تشخیص ہے۔ کہ آپکو غم و غصہ کی وجہ سے بخار ہوا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر آپ کی خبر گیری جلد نہ کی جاتی تو دماغ کی کوئی نہ کوئی نالی پھٹ جاتی اور آپ بچ نہ سکتے۔ بخار بڑی شدت کا تھا میں خود آپ کو دیکھ کر مایوس ہو گئی تھی۔ اتنے تیز بخار کا مریض میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

میں نوکر سے پھر مخاطب ہوا۔

"جب تم ڈاکٹر ثریا کو یہاں لائے۔ کیا اس وقت بھی مجھ پر ہذیان طاری تھا۔ میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"آپ بار بار کہتے تھے۔ ادشا! ہمیں ایسے وزیر اعظم کی ضرورت نہیں۔ آؤ۔ اسے ابھی نکال دیں۔ بابو جی! وہ ادشا اور وزیر اعظم کون ہیں؟"

مجھے بڑی ندامت ہوئی کہ ڈاکٹر ثریا کا میرے گھر میں آنا گویا جیتی کے گھر میں نارائن کا آنا تھا۔ وہ آئیں بھی تو صرف میرا ہذیان سننے کے لئے۔ میں نے نوکر سے کرید کرید کر پوچھا کہ میں نے ڈاکٹر ثریا کی موجودگی میں اور کیا کچھ کہا۔ اس نے کہہ دیا کہ وہ میرے لئے دوائی لانے ہسپتال چلا گیا تھا۔ اسے معلوم نہیں میں نے کیا کیا کہا۔

میں بار بار سوچتا کہ ڈاکٹر ثریا میرے اس ہذیانی فقرہ کا کیا مطلب نکالے گی۔ ادشا کا نام اگر اس کی سمجھ میں آسکتا ہے تو ایک کلرک کی زبان سے نکلا لفظ "وزیر اعظم" اس سارے فقرہ کو مہمل بنا دے گا۔ ایک کلرک

ادشا، وزیر اعظم یہ تین لفظ بظاہر بالکل بے جوڑ ہیں۔ ڈاکٹر ثریا ان میں ربط پیدا نہیں کر سکتی۔

بخار سے آرام آنے پر سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ کرایہ کے مکان کو چھوڑ دیا اور اپنا سامان وغیرہ ہسپتال کے کوارٹر میں لے آیا۔ ادھر سے فارغ ہو کر میں نے اپنے حالات پر غور کیا۔ میرا سیکرٹری ہونا ناممکن تھا۔ اس لئے کہ وزیر اعظم تدبر سے خالی نظر آیا۔ سپرنٹنڈنٹ بن سکنے کی کوئی امید نہ تھی کیونکہ سیکرٹری ایک اخلاق باختہ آدمی تھا اور میرے جیسے آدمی کے پاس اس کی ہمدردی حاصل کرنے کے ذرائع مضبوط نہ ہو سکتے تھے۔ ہیڈ کلرکی کے متعلق پہلے ہی سپرنٹنڈنٹ نے جواب دے دیا تھا۔ آدمی اپنے آپ کو دھوکے میں رکھ کر زندگی کے کھردرے حقائق کو کمخواب کا جامہ سمجھنے لگے۔ یہ اور بات ہے۔ ورنہ زندگی کے حقائق پتھر سے زیادہ سخت اور کانٹوں سے زیادہ نوکیلے ہیں کامیابی کا پہلا گُر یہ ہے کہ جس صورت میں یہ حقائق اپنے آپ کو پیش کریں ان کی وہی صورت تسلیم کر لی جائے۔ ان حقائق کی موجودگی سے انکار کرنا یا ان کی تشریح اپنی خواہش کے مطابق کرنا جہالت ہے۔ اور اسے ناکامی کا پیش خیمہ تصور کرنا چاہئے ہیں اپنے حالات پر غور کر کے اس نتیجہ پر پہنچا کہ میرے محکمہ کا کوئی افسر دیانتدار نہیں۔ مجھے یا کلرکی پر ہی زندگی بسر کر دینی چاہئے یا کسی خارجی طاقت کو حرکت میں لانا چاہئے کلرک رہتے ہوئے نہ میں محکمہ کی اصلاح کر سکتا ہوں نہ اپنے آپ کو آ

بلندی پر پہنچا سکتا ہوں جس پر پہنچے بغیر میں اپنے آپ کو اوشا کی نظروں میں حقیر نہ سمجھوں۔ اب میرے لئے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ میں وزیر اعظم بنوں۔ محکمہ میں میری ترقی افسروں کے ہاتھ میں ہے۔ وہاں میں طاقت آزمائی کر چکا اور نا کام رہا۔ وزیر اعظم بننا عوام کی رائے پر منحصر ہے۔ اگر اوشا اور اشرف کو مجھ میں قابلیت کی رمق نظر آتی ہے تو عوام میں اور لوگ بھی ایسے ہو سکتے ہیں جو اوشا اور اشرف کے ہم خیال ہوں۔ باقی رہے مخالف حالات۔ اگر صوبہ کے باقی محکموں کا بھی یہی حال ہے جو ہمارے محکمہ کا ہے اور موجودہ وزارت سے صوبہ کے ہر شعبۂ زندگی کو اپنی بد اغلاقیوں کا ثبوت دے چکی ہے۔ اور اس کا پیدا کیا ہوا ماحول میری مخالفت کرے تو اس مخالفت کی حقیقت بارود کی سی ہے۔ چنگاری کا اس کے سامنے ہونا شرط ہے۔ بارود خود بخود بھک سے اڑ جائے گا۔ میں نے آئے دن اخبارات میں شائع ہونے والے واقعات اور ان پر اخباروں کے تبصروں پر خیال ہی خیال میں نظر دوڑائی۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ جو دیانتدار آدمی نئی وزارت بنانے کی کوشش کریگا۔ اگر وہ اپنے آپ کو چنگاری بنا سکے۔ تو اس کے تمام مخالف حالات بارود بن جائیں گے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہ صوبہ کے موجودہ حالات بارود کا حکم رکھتے ہیں۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ میں چنگاری ہوں یا نہیں۔ حالات کو بارود کی صورت میں

تبدیل کرنے کے لئے مجھے کوشش کی ضرورت نہیں۔ اگر میرے چنگاری ہونے میں خامی ہے تو اسے دُور کرنا لازم ہے۔ میرا کام پچاس فیصدی پہلے ہی ہو چکا ہے۔ موجودہ وزارت نے حالات کو خود ہی بارود بنا دیا ہے۔ میں اپنے آپ کو چنگاری بنا لوں گا۔ میرا ہیڈ کلرک بن سکنا ناممکن اور وزیر اعظم بن سکنا ممکن ہے۔ آج دنیا میرے اس خیال پر ہنسے گی۔ کہ ایک کلرک وزیر اعظم بننے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ مگر اسے صحیح حالات کا علم نہیں وہ نہیں جانتی کہ میرے لئے کلرکی سے اگلا قدم وزیر اعظم بننا ہی ہو سکتا ہے۔ اس سے کم یا زیادہ کی گنجائش نہیں۔

اب مجھے اوشا کے پروگرام کی اہمیت معلوم ہوئی۔ نوجوان شہری طبقہ اوشا کی پشت پر ہے۔ اگر دیہات کو میں منظم کر لوں تو کامیابی میں کونسی کسر رہ جاتی ہے مجھے اوشا کی ذات پر پورا بھروسہ ہے۔ اگر شہری اور دیہاتی تنظیم سے وہ خود فائدہ اٹھانا چاہے تو مجھے اس میں عذر نہیں ہوگا۔ اصل مقصد صوبہ میں امن قائم کرنا ہے۔ اور یقیناً اوشا اس قابل ہے کہ وہ انصاف قائم کر سکے۔ اس کا نوجوان تحریک کو جاری کرنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ موجودہ بے انصافی کو برداشت نہیں کرتی۔ اگر اوشا وزیر اعظم بننا چاہے تو میں اس کے ماتحت ایک عام کارکن کی حیثیت سے کام کرونگا۔ اور اپنی تمام قابلیت اس کی اور صوبہ کی خدمت کے لئے وقف کر دوں گا۔ لیکن اگر اوشا کا عورت

ہونا اس کے وزیر اعظم بننے کے راستہ میں رد کا وٹ ثابت ہو۔ ہمارا صوبہ عورت کو سیاہ و سفید کا مالک بنانے سے بچ پائے۔ تو میں اسے صوبہ کی قدامت پسندی کہوں گا۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ انتظامی معاملات میں مرد عورت کی تخصیص اٹھ جائے۔ وقت تھوڑا ہے۔ اور کام زیادہ اگر ہمارا سارا وقت مخالفوں سے نپٹنے ہی گزر گیا۔ ہمیں مرد اور عورت میں تخصیص نہ کرنے کے سلسلہ میں صوبہ کی ذہنی تربیت کے لئے وقت نہ ملا تو اوشا فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے مجھے وزیر اعظم بننے دے گی۔ اور وہ خود بطور ایک کارکن کے کام کرے گی۔ اس سلسلہ میں کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور نہ پیش از وقت اس معاملہ کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے لئے ضروری ہے کہ میں اوشا سے کہہ دوں کہ دیہاتی تنظیم کا میں نے پورا وقت لے لیا ہے اور اسمبلی کے آئندہ انتخابات تک صوبہ کے سارے دیہات ایک لڑی میں پرو دئے جا چکے ہوں گے

سوال یہ تھا کہ سرمایہ کے بغیر کام کیسے چلے گا۔ میں نے گذشتہ بارہ چودہ سال کے عرصہ میں جو سرمایہ جمع کیا وہ ساڑھے تین سو تھا۔ کئی دفعہ کوشش کی کہ زیادہ روپیہ جمع ہو جائے تو شادی کی فکر کروں۔ مگر بچت نہ ہوئی اور شادی کا پروگرام سامنے آتا۔ ساڑھے تین سو روپے کے مصارف سے صوبہ کی ساری دیہاتی آبادی کو منظم کر سکنے کا خیال دیوانہ پن کی دلیل ہے۔ اس کے لئے مجھے ہزار ہا روپے کی ضرورت تھی روپے کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ اور یہی وہ چیز ہے جس سے میری

محروم تھا۔ اور محروم ہوں۔ روپیہ پیدا کرنے کی کوئی سبیل پیدا کرنی چاہیئے اس سلسلہ میں اشرف مفید ہو سکتا ہے وہ کاروباری آدمی ہے۔ اور مخلص دوست ہے۔ ممکن ہے۔ وہ کوئی سکیم بتا سکے۔ اسے اپنے راز میں لینا چاہیئے، تنظیم کے سلسلہ میں جتنے مخلص دوست مل سکیں کم ہیں مجھے یقین ہے کہ بیسیوں دوست میرے معاون نہیں گے۔ مگر ان دوستوں میں اشرف کا نمبر اول ہی رہے گا۔

مخلص دوست

انسان کا دل عجیب چیز ہے۔ اس میں ہر قسم کا خیال سما جاتا ہے۔ دنیا میں امن قائم کر کے اسے بہشت کا نمونہ بنانے کا خیال اگر دل میں موجود ہو سکتا ہے تو جہان کو لوٹ مار کا بازار سمجھ کر اس کا چین چھین لینے کی خواہش کے لئے بھی دل میں جگہ ہے۔ دوست کے لئے محبت، دشمن کے لئے نفرت دو متضاد جذبات ہیں مگر بیک وقت دونوں ہی دل میں موجود رہتے ہیں۔ قدرت کا کھیل ہے کہ کسی کے دل تک ہماری نظر نہیں پہنچ سکتی۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کسی کے دل میں ہمارے متعلق درحقیقت کیا خیال ہے ہمیں دل کی بجائے زبان پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ زبان جو کچھ کہہ دے ہم اس پر ایمان لے آتے ہیں۔

ہم کتنے جلد باز ہیں۔ کسی آدمی کے ظاہری رویّہ سے اس کے اچھے بُرے ہونے کا فوراً فیصلہ کر دیتے ہیں۔ حالانکہ تجربہ نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ بارہا ایسا ہوتا ہے جنہیں ہم فرشتہ خصلت تصور کرتے ہیں بعد میں وہ شیطان ثابت ہوتے ہیں۔ اور جن سے ہمیں اس وجہ سے نفرت ہوتی ہے کہ وہ بُرے لوگ ہیں۔ وہ بالآخر فرشتۂ رحمت بن کر ہمارے پاس آتے ہیں۔ یہ غلط فہمی کیوں ہے۔ محض اس لیئے کہ کسی کے دل کو دیکھ سکنا ممکن نہیں اور ہمیں ظاہری وضع پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر ہم دوسروں کے متعلق اپنا فیصلہ صادر کرنے میں جلدی نہ کریں تو کچھ عرصہ میں ان کی فطرت خود بخود بے نقاب ہو جائے۔ اور وہ اپنے اصلی روپ میں ہمارے سامنے آجائیں۔ انسانی زندگی حادثات اور واقعات سے عبارت ہے بیکار سے بیکار انسان کی زندگی کے پس پردہ واقعات و حادثات کے سینکڑوں تار ہلتے رہتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی ان تاروں کی حرکت انسان کو اپنے تصنّع اور بناوٹ سے غافل کر دیتی ہے۔ یا وہ سمجھ لیتا ہے کہ اس ایک خاص موقع پر دوستوں کو دھوکہ دیتے رہنے اگر وہ بے نقاب بھی ہو جائے لیکن اس کا مقصد پورا ہو جائے تو پروا نہیں۔ دونوں صورتوں میں انسان کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ اور دنیا کو اس کے متعلق اپنی وہ رائے تبدیل کرنی پڑتی ہے۔ جو اس نے جلد بازی میں قائم کی تھی۔

اشرف سے میری دوستی کا عرصہ بہت قلیل تھا مجھے کبھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ میری طرف اس کے یوں کھنچے آنے کی اصل وجہ کیا تھی۔ اس کی

زبان میں لوچ تھا اور وہ اپنے بیان کے مطابق امیر آدمی تھا۔ زبان کا لوچ اور امارت کا اظہار کم و بیش ہر انسان پر اثر کرتا ہے۔ ابتدائے دوستی میں اشرف سے میری کوئی امید وابستہ نہ تھی۔ پھر بھی غیر شعوری طور پر اس کے یہ دو حربے کامیاب رہے اور میں نے سمجھ لیا کہ وہ اچھا آدمی ہے

ملازمت میں ترقی کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے جو پروگرام بنایا میں نے مناسب سمجھا کہ وہ اشرف کو تفصیل کے ساتھ بتا دوں۔ اور آئندہ ہر بات میں اس سے مشورہ لوں۔ چنانچہ ایک دن اشرف مجھ سے ملنے کے لئے میرے کوارٹر میں آیا۔ تو میں نے اسے ساری رام کہانی کہہ سنائی۔ میں نے اسے بتایا کہ ملکی تحریک کو اب ہر حالت میں کامیاب کرنا ہے اور نہ صرف کامیاب کرنا ہے۔ بلکہ اس سے نتیجہ بھی اپنی مرضی کے مطابق برآمد کرانا ہے۔ اشرف نے میرے پروگرام کو بے حد پسند کیا اور کہہ دیا کہ میں سرمایا کے معاملہ میں بالکل بے فکر ہو جاؤں۔ اس کا بندوبست وہ خود کریگا۔ اور یہ پروگرام محض روپے کی کمی کی وجہ سے کبھی ادھورا نہیں رہے گا۔ اس کے جواب سے مجھے بہت مسرت ہوئی۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ اشرف اخلاص اور سچی دوستی کا مجسمہ ہے۔

دیہات سے میرے خطوط کا جواب بہت تسلی بخش آیا۔ بہت سے خطوط میں دعوت دی گئی تھی کہ میں ذاتی طور پر دیہات کا دورہ کروں اور اپنے دوستوں اور عزیزوں سے ملوں۔ بہت کچھ سوچ بچار

کے بعد آخر میں نے طے کر لیا کہ مجھے ایک مہینہ کی رخصت لے کر دور دراز کے ان دیہات میں پروانہ ہو جانا چاہئے تاکہ جن دیہات میں میری تھوڑی بہت واقفیت ہے ان کے توسط سے باقی دیہات میں بھی مرکزی انجمن کی شاخیں قائم کی جائیں۔ اشرف نے میرے اس فیصلہ کو بہت سراہا۔ اور کہا کہ اس کی کاروباری مصروفیتیں زیادہ ہیں۔ ورنہ وہ بھی میرے ہمراہ چلتا۔ اس نے میری جائداد وغیرہ کے متعلق بہت سے سوال پوچھے میں نے بتا دیا کہ شہر میں میری کوئی جائداد نہیں۔ گاؤں میں چھ سات ہزار روپے کی زمین ورثہ میں ملی تھی۔ وہ موجود ہے۔ وہاں مکان بھی ہے۔ لیکن دیہات میں مکان کی قیمت برائے نام سمجھی جاتی ہے۔

اشرف نے یکایک گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"آپ نے اپنے سارے حالات بتا کر مجھے اپنا ہم راز بنا لیا ہے میں پوری کوشش کرونگا کہ اپنے آپ کو اس راز داری کا اہل ثابت کر سکوں۔ آپ میں ایک قسم کی مقناطیسی کشش ہے جو مجھے آپ کے پاس کھینچ لائی۔ اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ خود بھی اپنے راز سے آپ کو آگاہ کر دوں۔ میرا راز جان لینے کے بعد آپ میرے متعلق کیا رائے ظاہر کرینگے؟ یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن میں آپ کو اپنا راز بتائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بات یہ ہے کہ مجھے ڈاکٹر ثریا سے محبت ہے میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نہیں جانتے کہ محبت جب انسان کے خون میں سرایت کر جائے۔ تو وہ انسان کے دماغ کو ماؤف

کر دیتی ہے ۔ میں ایک کاروباری آدمی ہوں۔ میں نے ہزارہا روپیہ کمایا ہے اور کما سکتا ہوں۔ مگر محبت کے جنون نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ ڈاکٹر ثریا کو مجھ سے اب تک یہ علاقہ ہے۔ کہ میں ملنے کے لئے جاؤں تو وہ مل لیتی ہے۔ اور بس۔ مجھے کبھی جرأت نہیں ہوئی کہ اپنی زبان سے اس کے سامنے اظہارِ محبت کروں۔ خطوط درجنوں لکھ چکا ہوں۔ ایک بھی خط کا جواب نصیب نہیں ہوا۔ اس کا رویہ میرے خلاف نہیں۔ لیکن محض خلاف نہ ہونا میری تسلی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اور جلد کرنا چاہتا ہوں۔ میرا کاروبار تباہ ہو رہا ہے۔ میں کسی کام میں دلچسپی نہیں لے رہا۔ اگر میری حالت چند دن اور یہی رہی تو میں پاگل ہو جاؤنگا۔ یا دل کی حرکت بند ہونے سے مر جاؤں گا۔ میرے زندہ رہ سکنے کی صرف ایک سبیل ہے کہ ڈاکٹر ثریا سے میری شادی ہو جائے۔ اگر میری یہ خواہش پوری ہو جائے تو میرے دماغ کو سکون مل جائے گا۔ پھر میں کاروبار سے اتنا روپیہ پیدا کر سکتا ہوں کہ آپ ایک صوبہ چھوڑ سارے ہندوستان کو منظم کرنے کا پروگرام بنائیں تو اس کے اخراجات بھی پورے ہو سکتے ہیں۔"

میں نے جواب دیا۔

"شادی کی خواہش ایک قدرتی خواہش ہے۔ نہ اس کے اظہار میں قباحت ہے۔ نہ اس کے لئے کوشش قابلِ اعتراض۔ آپ کی گفتگو سن کر مجھ پر تو کوئی برا اثر نہیں ہوا۔ آپ کے متعلق میری سنائے

اب بھی وہی ہے۔ جو پہلے تھی۔ ڈاکٹر ثریا میری افسر ہیں۔ وہ بیحد ہمدرد اور پارسا خاتون ہیں۔ اگر ان سے آپ کی شادی ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی زندگی سنور جائے گی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ آپ کو ڈاکٹر ثریا جیسی بیوی تمام روئے زمین پر نہیں ملیگی۔ آپ میرے دوست ہیں۔ ڈاکٹر ثریا میری مہربان افسر ہیں۔ آپ دونوں کے یکجا ہو جانے سے مجھے کتنی خوشی ہوگی اس کا اندازہ آپ نہیں کر سکتے۔"

میری زبان سے یہ الفاظ غیر ارادی طور پر نکل گئے۔ زبان اور دل میں قطعاً اتفاق نہ تھا۔ میں وجہ بیان نہیں کر سکتا۔ مگر اشرف کی تقریر سے میرے دل کو دھکا سا لگا۔ اور مجھے ٹھنڈا پسینہ آنے لگا۔ اپنے اضطرا کو چھپانے کے لئے میں نے مصنوعی قہقہہ لگانے کی کوشش کی۔ بعد میں خود مجھے اپنی اس کیفیت پر تعجب ہوا۔ کیونکہ میرے اور ڈاکٹر ثریا کے درمیان نہ کوئی ایسی وجہ موجود تھی۔ اور نہ موجود ہو سکتی تھی۔ جس کی بنا پر اس کا کسی کی بیوی بننا میرے لئے پریشانی کا باعث ہوتا۔

جہاں تک ملکی سکیم کا تعلق تھا اشرف کے الفاظ نے میرے دل کو کافی سہارا دیا۔ انتہائی تاریکی میں ڈوبا ہوا مستقبل مجھے کچھ کچھ روشن دکھائی دینے لگا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ میرے جو تھوڑے بہت ذرائع ہیں میں انہیں زیادہ سے زیادہ موثر طریق پر استعمال کروں گا اور جو فیصلہ کر چکا ہوں۔ اس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا۔

مجھے جن دیہات کا دورہ کرنا تھا۔ ترتیب وار ان کا پروگرام بنا لیا اور یہ طے کر لیا کہ ہر مقام پر صرف اتنا عرصہ ٹھہرا جائے جتنا عرصہ وہاں ٹھہرنا بہت ضروری ہو۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ دیہات میں گھوما جا سکے۔ میں جب سے ملازم ہوا تھا۔ بہت کم رخصت لی تھی۔ اس لئے مجھے ایک مہینہ کی رخصت مل جانی ایک طے شدہ امر تھا۔ چنانچہ میں نے رخصت کیلئے درخواست دے دی اور ادشا کو اطلاع کر دی کہ میں عنقریب دیہات کے دورہ پر روانہ ہونے والا ہوں۔ روانہ ہونے سے پہلے انہیں ضرور ملوں گا۔ سیونگ بینک سے تین سو روپیہ نکلوا لیا۔ اور سفر کا سامان درست کر کے بالکل تیار ہو بیٹھا۔

ادشا سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اُسے بتایا کہ دیہات سے میرے خطوط کا جواب بہت تسلی بخش آیا ہے۔ انجمن کی چند شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔ بہت سی اور شاخیں میرے اس سفر کے دوران میں بن جائیں گی۔ اور میرے واپس آنے سے پہلے صوبہ کے بیشمار دیہات منظم ہو چکے ہوں گے۔ میں نے اسے دیہات سے آئے ہوئے خطوط دکھائے۔ جن میں مجھے دورہ کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ انہیں پڑھکر ادشا بےحد خوش ہوئی۔ میں نے ایک خاص قسم کی چمک اس کی آنکھوں میں دیکھی۔ جو اس سے پہلے نہ صرف اس کی آنکھوں میں بلکہ کسی عورت کی آنکھوں میں نہ دیکھی تھی۔ وہ خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ اس کی کوشش کے باوجود اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ اور ہنسی

پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں ہر دوسرے تیسرے دن اپنے کام کی رپورٹ اُسے بھیجتا رہوں۔ میں نے اپنے پروگرام کی ایک نقل اسے دے کر عرض کیا کہ اگر اسے کبھی فرصت ہو اور وہ مجھے خط لکھنا مناسب سمجھے تو پروگرام میں یہ دیکھ کر کہ میں کس تاریخ کو کس جگہ ہونگا۔ لکھ سکتی ہے۔ ادشا نے مجھ سے کہا کہ آئندہ ایک مہینہ شہری نوجوانوں کی تنظیم کا کام وہ بھی زیادہ مستعدی سے کرے گی اور میرے واپس آنے تک صوبہ کے بڑے بڑے شہر منظم ہو چکے ہوں گے۔

عورت ذات بڑی ہوتی ہے

دورہ پر میرے روانہ ہونے میں صرف تین دن باقی رہ گئے تھے۔ لیکن میری درخواست اوپر سے منظور ہو کر نہیں آئی تھی۔ پورا ایک مہینہ دفتر بغیر کلرک کے نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ میری جگہ عارضی طور پر کسی دوسرے کلرک کا تقرر ضروری تھا۔ غالباً محکمہ یہ سوچ رہا تھا کہ ہیڈ آفس سے کس کلرک کو ایک مہینہ کے لئے یہاں تبدیل کرے یہی وجہ تھی کہ میری درخواست منظور ہونے میں دیر ہوئی۔
ڈاکٹر ثریا عام طور پر صبح سات بجے ہسپتال میں آتی اور دس

گیارہ بجے واپس گھر چلی جاتی۔ البتہ نرس بارہ بجے تک کام کرتی اور میں ایک بجے تک موجود رہتا۔ آج بارہ بج گئے۔ لیکن ڈاکٹر ثریا حسبِ دستور موجود تھی۔ اس کے دفتر میں موجود ہونے کی وجہ سے نرس بھی اپنے معمول کے مطابق بارہ بجے نہ جا سکتی تھی۔ جب افسر اپنی کرسی سے نہ اٹھے تو وفادار ماتحت کیسے دفتر سے چلا جائے۔ نرس بھی نہ گئی۔ آخر ڈاکٹر ثریا کو میں نے کہتے سنا۔

"نرس! مجھے یہاں ابھی کام ہے۔ میں زیادہ دیر بیٹھوں گی۔ تمہارا کام ختم ہوا۔ اب تم جا سکتی ہو۔"

میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ میرے دفتر کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ میں ڈاکٹر ثریا یا نرس کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پاؤں کی آہٹ سے میں نے قیاس کیا کہ نرس چلی گئی ہے۔ میں نے فوراً پنسل اور نوٹ بک سنبھالی اور ڈاکٹر ثریا کی آواز کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے نرس سے کہا تھا کہ اسے ابھی کچھ کام ہے۔ کام یہی ہو سکتا تھا کہ وہ دو چار چٹھیاں لکھا دے اور میں انہیں ٹائپ کر دوں۔ میں اس کے لئے بالکل تیار ہو گیا۔ اتنے میں باہر پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ میرے کان اس خاص چاپ سے مانوس تھے۔ یہ ڈاکٹر ثریا کے تشریف لانے کی علامت تھی۔ وہ پہلے بھی ایک دو دفعہ میرے کمرہ میں آکر نوٹ لکھا گئی تھی۔ غالباً اب بھی وہ میرے کمرہ ہی میں نوٹ لکھانے کے لئے تشریف لا رہی تھیں۔

ڈاکٹر ثریا میرے کمرہ میں داخل ہوئی۔ اور داخل ہوتے ہی اس نے اپنے ہاتھوں سے دروازہ پوری طرح کھول دیا۔ اور خود دروازہ کے قریب میرے میز سے سہارا لگا کر کھڑی ہو گئی۔ میں ازراہِ ادب کھڑا ہو گیا۔ ایک ہاتھ میں پنسل اور دوسرے میں نوٹ بک لیے سر جھکائے کھڑا تھا کہ وہ کچھ بولے۔ اس نے کہا۔

"بشیر! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

میں یکایک چونکا اور ڈاکٹر ثریا کی طرف دیکھا۔ وہ عجیب پریشانی کے عالم میں تھی۔ ساڑھی سر سے اتر کر شانوں پر آ رہی تھی۔ سر کے بال قدرے پریشان ہو رہے تھے۔ اس کا چہرہ عجیب کشمکش کا مرقع بن رہا تھا۔ غصہ، حیا اور احساسِ وقار نے حسن کو سہ آتشہ بنا دیا تھا۔ میں اس صورتِ حالات سے بوکھلا گیا میں نے عرض کیا۔

"جی۔ فرمایئے"

"میں پوچھتی ہوں۔ تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" یہ اس کا سوال تھا۔

میں نے اپنی وہی پرانی گردان سناتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر! میں ایک کلرک ہوں۔ بارہ چودہ سال ملازمت کی۔ اب میری تنخواہ ساٹھ روپے ہوئی ہے۔ میں بیوی کے اخراجات کہاں سے مہیا کر سکتا ہوں۔ میرے حالات اجازت نہیں دیتے

ورنہ میں کبھی کا شادی کرچکا ہوتا۔"

ڈاکٹر ثریا" تم کلرک نہیں ہو۔ تم اپنے آپ کو کلرک ظاہر کرکے مجھے دھوکا دے رہے ہو۔ تم مجھے ہی نہیں ساری دنیا کو دھوکا دے رہے ہو۔ تم پراسرار آدمی ہو۔ میں تمہارا عذر ماننے کے لئے تیار نہیں۔ تمہیں دوسروں کی زندگی خراب کرنے میں مزا آتا ہے۔ تم یہ سلسلہ کب تک بند نہیں کروگے؟ میں پوچھتی ہوں۔ اس کی کوئی حد بھی ہے یا نہیں؟"

ڈاکٹر ثریا کے ان الفاظ نے مجھ پر بجلی گرا دی۔ میں سوچنے لگا۔ کہ کیا مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی؟ کیا ڈاکٹر ثریا کو میری کسی ایسی کمزوری کا علم ہوگیا جس کا خود مجھے بھی علم نہیں۔ آخر اس گفتگو کا مطلب کیا تھا؟ میرا گلا گھٹ رہا تھا۔ ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ زمین گھوم رہی تھی۔ میں نے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ میں سچ مچ کلرک ہوں۔ آپ سپرنٹنڈنٹ کو ٹیلیفون کرکے پوچھ سکتی ہیں کہ مجھے کلرکی کرتے برسوں گزر گئے ہیں۔ میں کسی کی زندگی کیسے خراب کرسکتا ہوں۔ مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی یہ کسی کی شرارت ہے کہ میرے خلاف آپ سے کہہ دیا۔ مجھے پتہ ہے یہ ساری شرارت سپرنٹنڈنٹ کی ہے۔ وہ میری جان کا دشمن ہے۔ ڈاکٹر! میں بالکل بے قصور ہوں۔"

ڈاکٹر ثریا: "روپے کی کمی کوئی وجہ نہیں۔ بنک میں میرا ستر ہزار روپیہ جمع ہے۔ خرچ کے لئے وہ کافی ہے۔ تم شادی کرلو۔ تمہاری سمجھ بہت موٹی ہے۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں تمہیں شادی کرنی چاہئے۔ میں کہتی ہوں تمہیں شادی کرنی ہوگی۔ ثریا کو ایسے مرد کی ضرورت ہے۔ جس میں" زندگی کی رمق ہو۔ اُسے چلتی پھرتی مشین کی ضرورت نہیں۔ مجھے جتنے لوگ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ وہ سب ایک طرح کی مشینیں ہیں۔ ان کا کوئی نصب العین نہیں۔ ان کی زندگی میں کوئی مدّ و جزر نہیں وہ مشین کی طرح اپنی خواہشات کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ تمہارے پاس روپیہ نہ سہی تم "زندہ" تو ہو۔ انسان تو ہو۔ مجھے انسان کی ضرورت ہے۔"

میں "مگر ڈاکٹر۔۔۔۔۔"

ڈاکٹر ثریا: "میں اس وقت ڈاکٹر نہیں۔ میں ثریا ہوں۔ بات کرنے کا سلیقہ سیکھو۔ ثریا سے بات کرتے وقت اسے ثریا کہہ کر مخاطب کرنا چاہئے۔ اب تم کوئی نیا بہانہ پیش کرنے لگے ہو؟ مجھے سب معلوم ہے۔ تمہیں اوشا سے محبت ہے کیا تمہیں یقین ہے کہ اوشا غیر مسلم ہوتے ہوئے تم سے شادی کرلے گی؟ کیوں ناحق اپنے دل کو دھوکا دیتے ہو؟ ان تلوں میں تیل نہیں۔ اس دن بخار میں تم بار بار اوشا کے نام کا ورد کرتے تھے۔ میں نے وہ سب سن لیا تھا۔ اور خود تمہاری زبان سے سن لیا تھا۔ اب

کہو۔ کیا کہتے ہو؟

میں "ڈاکٹر اصل بات ......"

ڈاکٹر ثریا "میں اس وقت ڈاکٹر نہیں۔ ثریا ہوں"

میں "میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔ آپ توجہ سے میری گزارشات تو سن لیں۔ اس کے بعد میں اپنی قسمت کا فیصلہ آپ پر چھوڑ دونگا۔ جو فیصلہ آپ کر دیں مجھے منظور ہو گا۔ آپ کو میرے متعلق غلط فہمی کی حد تک حسن ظنی ہے۔ میں ایک کلرک ہوں۔ اور گذشتہ چودہ برس سے کلرک ہوں۔ اس طویل عرصہ میں میری زندگی کسی مدّ و جزر سے آشنا نہیں ہوئی۔ میرا نصب العین ہیڈ کلرک بننا تھا۔ میں چار دفعہ اس اسامی کے حصول سے محروم ہو چکا ہوں۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ کی خوشامد کی۔ کامیاب نہ ہوا۔ سیکرٹری سے ملنے کے لئے گیا۔ ناکام رہا۔ وزیرِ اعظم سے بالمشافہ گفتگو کی۔ اس نے مجھے پاگل کہا۔ اس دن میرے بخار کی وجہ وہ غم و غصہ تھا جو وزیرِ اعظم کی ملاقات سے ہوا۔ ان واقعات میں اگر آپ کو زندگی کی رمق نظر آتی ہو تو مجھے بھی دکھا دیجئے۔ میرے دل میں آپ کے لئے بیحد احترام ہے۔ مجھ پر آپ کے بہت احسانات ہیں۔ میں آپ کی کرمفرمائیوں کے بوجھ سے دبا ہوا ہوں مجھے ڈر ہے کہ آپ کا موجودہ ارشاد میری شادیٔ مرگ کا باعث نہ بن جائے۔ آپ انصاف فرمائیں کہ میں آپ کو زندگی میں کونسا سکھ پہنچا سکوں گا؟ آپ کو زندہ انسان

کی ضرورت ہے۔ میرا ماضی قطعاً مردہ ہے۔ حال کی لاش کو ٹیکے دے کر زندہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں مستقبل پر بحران طاری ہے۔ کیا میں زندہ انسان ہوں۔ میں یقیناً ایک مشین ہوں۔ مشین کا چکر انہیں مقامات سے گزرتا ہے جن مقامات سے میری زندگی گذر رہی ہے۔ میں اپنے آپ کو فریب دے کر انسان اور وہ زندہ انسان کیسے کہہ لوں؛ آپ کی جگہ اگر کوئی اور خاتون موجود ہوتی تو شاید میں یہ غلط فہمی موجود رہنے دیتا۔ لیکن آپ کے احسانات نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ بھیانک حقائق کے رُخ سے پردہ ہٹا دوں۔ ان تمام حالات کے ہوتے ہوئے اگر آپ مجھے قبول فرمائیں تو مجھے نہ صرف کوئی عذر نہیں بلکہ اُسے قسمت کا کرشمہ سمجھوں گا۔ اور مدتوں میری آنکھوں کو یقین نہیں آئے گا۔ کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں یا حقیقت میرے سامنے ہے۔ میرے ایک دوست اشرف خاں کو آپ سے دیوانگی کی حد تک محبت ہے۔ وہ امیر آدمی ہے۔ وہ آپ کے لئے ہر سکھ کا بندوبست کر سکتا ہے۔

اب آپ کا کیا ارشاد ہے؟ میں آپ کو ڈاکٹر کہہ کر پکاروں یا ڈاکٹر ثریا یعنی ثریا کہوں؟"

ڈاکٹر ثریا سر جھکائے دیر تک گہری سوچ میں ڈوبی رہی۔ پھر آہستہ سے کہا، "میں سوچ کر بتاؤں گی۔"

مجھے رات بھر نیند نہ آئی۔ میں فیصلہ نہ کر سکا کہ میں نے ثریا کو جو

جواب دیا۔ وہ درست تھا یا نہیں۔ کبھی دل میں خیال آتا کہ وہ خاوند ہی کیا جو بیوی کا محتاج ہو کر رہے۔ اگر ثریا سے میری شادی ہو جائے تو مجھے ہمیشہ اس سے دب کر رہنا پڑے گا۔ اور انجام کار جب وہ دیکھے گی کہ میں در اصل ایک کلرک ہی ہوں۔ تو اسے پشیمانی ہو گی کہ اس نے ایک افسر ہو کر کلرک سے کیوں شادی کی۔ اور اس کی یہ بے اطمینانی خدا جانے کن کن خرابیوں کا باعث بنیں گی۔ پھر اشرف درمیان میں ہے۔ اس نے اپنا راز نہ بتایا ہوتا۔ تو بات بھی تھی۔ اس کا راز دان ہو کر ثریا سے شادی کر دوں تو دوست سے غداری کروں گا۔ میں نے بہت اچھا کیا کہ معاملہ ایمانداری سے ثریا کے رو برو رکھ دیا۔ کبھی میں سوچتا کہ آخر مجھے شادی کرنی ہے ثریا حسین ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود باحیا اور منکسر المزاج ہے۔ پھر اس کے پاس روپیہ بھی ہے۔ شادی کے متعلق خود اس کی طرف سے تحریک ہونے پر میرا معاملہ کی یوں تشریح کرنا سراسر بیوقوفی اور حماقت تھی۔ اشرف امیر آدمی ہے وہ جب دیکھتا کہ ثریا نے شادی کر لی ہے تو کوئی اور لڑکی ڈھونڈ لیتا۔

اسی قسم کے متضاد خیالات آتے رہے۔ اور میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ تاہم ایک بات ضرور تھی۔ میں نے اندازہ کیا۔ کہ مجھے ثریا سے محبت ہے۔ مجھے پہلے اس کا احساس نہیں تھا۔

مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ میں جس جذبہ کو احترام کا نام دیتا تھا۔ وہ دراصل مفرد نہ تھا۔ بلکہ اس کے دو جزو تھے تعظیم اور محبت۔ میری اور ثریا کی پوزیشن ماتحت اور افسر کی تھی۔ اس لئے تعظیم کا جزو غالب رہا۔ اور محبت چھپی رہی۔

دوسرے دن ثریا کے چہرہ سے سکون اور اطمینان ظاہر تھا۔ میں اس کا فیصلہ سننے کا منتظر تھا۔ لیکن ہمت نہ پڑی کہ خود اس سے پوچھوں۔ گیارہ بجے کے قریب وہی شیریں آواز آئی۔

"بشیر!"

میں نوٹ بک اور پنسل لے کر گیا۔ ثریا نے دو مختصر چٹھیاں لکھائیں۔ میں واپس لوٹنے ہی کو تھا کہ اس نے اپنی ساڑھی کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"بشیر! تمہاری شادی کا بندوبست میں کروں گی۔ دو ایک لڑکیاں ہیں میرے ذہن میں۔ میں ایسی لڑکی منتخب کروں گی۔ جو تمہارے کام سے مطابق ہو۔ تم ایک اچھے کلرک ہو۔ میں تمہارے کام سے بہت خوش ہوں مجھے غلط فہمی تھی کہ شائد اوشا سے تمہیں محبت ہے۔ غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں۔ کہ تم دونوں کے درمیان ایک بات بھی مشترک نہیں۔ اس لئے تو تمہارے درمیان محبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے ثریا کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اسے جواب دینے

کے لئے میرے ذہن میں ایک بھی لفظ موجود نہ تھا۔ اگر الفاظ ہوتے بھی تو میں انہیں ادا نہ کر سکتا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی وزنی چیز میرے سینے سے اٹھ کر منہ کی طرف آئی اور وہ حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ میں نے آہستہ آہستہ قدم بڑھائے اور اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ وہی دو چٹھیاں جنہیں میں پانچ منٹ میں ٹائپ کر لیتا تھا۔ ایک گھنٹہ میں ٹائپ ہوئیں۔

دوسرے دن صبح میں دفتر جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ کہ اشرف آیا۔ وہ بہت خوش دکھائی دیتا تھا۔ آتے ہی اس نے کہا۔

"مجھے مبارک باد دیجیئے۔ میرا کام بن گیا۔ ثریا نے مجھ سے شادی کرنی منظور کر لی ہے۔ آپ کے دورہ سے واپس آنے تک ہماری شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہوگی۔ دوست! اب میرے دماغ کو سکون ہے۔ آپ دیکھیں گے۔ میں کس تیزی سے روپیہ کماتا ہوں۔ اب میری زندگی کا مقصد صرف آپ کی تحریک کو کامیاب کرنا ہے اور بس!"

میں کچھ نہ بولا۔ اس نے اپنے جیب سے پانچ پانچ روپے والے نوٹوں کا ایک بنڈل میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"یہ پانچ سو روپے کے نوٹ ہیں۔ انہیں اپنے پاس رکھئے میں آج ہی کسی وقت ہسپتال میں آکر آپ سے یہ لیلوں گا۔ مجھے

جلدی ہے - ایک ضروری کام پر جا رہا ہوں ۔"

یہ کہہ کر وہ مجھے کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر جا چکا تھا۔ میں نے نوٹوں کا بنڈل جیب میں ڈالا اور دفتر چلا گیا۔ کوئی دو گھنٹے بعد نرس نے آکر مجھے کہا کہ باہر کوئی بلاتا ہے۔ میں باہر آیا تو دیکھا اشرف ڈاکٹر ثریا کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اشرف نے کہا۔

" بھئی مجھے دس روپے کی ضرورت ہے۔ صرف دس روپے دے دیجئے ۔"

میں نے نوٹوں کا بنڈل جیب سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے اصرار کیا کہ اسے صرف دس روپے کی ضرورت ہے باقی نوٹ میں اپنے پاس رکھوں۔ میں نے بنڈل میں سے دو نوٹ نکال کر اس کے حوالے کیئے۔ اور بنڈل پھر جیب میں ڈال لیا۔ یہ سب کارروائی ایک ہی منٹ میں ہوگئی ۔ اس دوران میں اشرف نے ثریا کی طرف اور ثریا نے اشرف کی طرف دیکھا۔ دونوں مسکرائے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ گئے۔ جسے میں نہ سمجھ سکا۔ مگر مجھے ان کی یہ حرکت بہت بری محسوس ہوئی۔ شام کو اشرف میرے کوارٹر میں آیا۔ اور نوٹوں کا بنڈل واپس لے گیا اسی دن میری رخصت منظور ہوگئی۔ اور ہیڈ آفس سے ایک کلرک مجھے فارغ کرنے کے لیے آگیا۔ میں شام کی گاڑی سے دورہ پر روانہ ہوگیا اشرف مجھے الوداع کہنے کے لئے ریلوے سٹیشن پر موجود تھا۔

دیہات میں

سب سے پہلے میں موضع گجرام پہنچا۔ یہاں میرا ایک عزیز نمبردار تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ زمیندار جب کام کاج سے فارغ ہوکر شام کو کھیتوں سے گھر آئیں میں ان سے گفتگو کروں گا۔ جلسہ منعقد کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نہ لیڈر ہوں۔ نہ میرا پروگرام تقریر کرنے کا ہے۔ میں ان سب کا بھائی ہوں۔ یہ میرے بھائی ہیں شام کو برادری کے طور پر ہم سب مل بیٹھیں گے۔ ان کی سنوں گا۔ اپنی سناؤں گا۔ نمبردار نے میری تجویز بہت پسند کی۔ اور اسی وقت چوکیدار سارے گھروں میں کہہ آیا۔ کہ شام کا کھانا کھانے کے بعد ہر زمیندار نمبردار کی حویلی میں آجائے۔

اندھیرا ہوتے ہی زمینداروں کی آمد شروع ہوگئی۔ کوئی گھنٹہ بھر میں حویلی کا صحن بھر گیا۔ ہر شخص اپنا حقہ ہمراہ لایا تھا۔ نمبردار نے چار پائیاں ڈال دی تھیں۔ انہیں پر بیٹھے وہ سب حقہ پیتے رہے۔ جب سارے زمیندار آچکے تو نمبردار نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ اور کہا کہ میں ان سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ سب نے حقہ کی نے منہ سے علیحدہ کردی۔ اور ہمہ تن گوش ہو گئے۔ میں نے ان

سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میں بھی تمہاری طرح زمیندار ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آپ ان پڑھ ہیں اور میں پڑھا لکھا ہوں۔ آپ اپنے کھیتوں سے پیدا کی ہی روزی کھاتے ہیں۔ میں اس روپے سے تنخواہ پاتا ہوں جو ہم سب زمیندار بطور لگان سرکار کو ادا کرتے ہیں۔ میں ریاض آباد میں ملازم ہوں۔ اور آپ سے صرف بھائی چارہ کی وجہ سے دریافت کرنے کے لئے آیا ہوں کہ آپ کو کیا کیا تکلیفیں ہیں۔ آپ کو جو جو تکلیف ہو صاف صاف کہیئے میں سب کچھ سننا چاہتا ہوں۔"

ایک زمیندار نے کہا۔

"سب سے بڑی تکلیف یہ ہے کہ حاکم ہمیں بیگار میں پکڑ لے جاتے ہیں۔ سارا دن ہم سے کام لیتے ہیں۔ جب کھانا کھانے کا وقت ہوتا ہے تو گالیاں دیکر ہمیں روٹی بھیج دیتے ہیں۔ اس مصیبت کا کوئی علاج ہونا چاہیئے۔ پولیس والوں نے ہمیں خاص طور پر بہت تنگ کر رکھا ہے۔ ہمارے اپنے مویشیوں کو چارہ ملے یا نہ ملے۔ تھانیدار کی گھوڑی کے لئے ہمیں اپنے گھر سے اپنے ہی سر پر اٹھا کر چارہ لیجانا پڑتا ہے۔"

دوسرا بولا۔

"ہمارے گاؤں کی زمین ناقص ہے۔ ساتھ والے گاؤں کی زمین اس سے بہتر ہے۔ مگر حال ہی میں جو بندوبست ہوا۔ اس میں ہماری

زمین کو بڑھیا شمار کر کے لگان کی شرح بڑھا دی گئی اور سائڈ والے گاؤں کا رقبہ کاغذات میں بنجر دکھا کر اس کی شرح برائے نام مقرر کر دی گئی۔ یہ کیسی بے انصافی ہے بات اتنی تھی کہ اس گاؤں والوں نے پانچ سو روپے اکٹھے کر کے پٹواری کو دے دیئے جس نے تحصیلدار کو بھی اس سے حصہ دیدیا۔ اور گاؤں کو خاص رعایت دیدی۔ ہم غریب لوگ تھے رشوت نہ دے سکے مفت میں مارے گئے"

تیسرے نے ایک گوشہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو یاد ہوگا دو مہینے ہوئے۔ یہاں اولوں کی سخت بارش ہوئی تھی۔ اس سے ہماری فصلوں کو سخت نقصان پہنچا۔ اور فصل بالکل تباہ ہو گئی۔ سرکاری لگان معاف کرانے کے لیے ہم نے افسروں کو درخواستیں دیں۔ جس پر ایک حاکم مقرر ہوا کہ وہ ہماری کھیتوں کا معائنہ کرے۔ اس حاکم کے آنے سے ایک دن پہلے اس کے آدمی یہاں آئے۔ اور ہم سے کہنے لگے کہ اگر سرکاری لگان معاف کرانا ہے تو حاکم کے لئے روپیہ اکٹھا کرو۔ یہ حاکم روپیہ لے کر فوراً کام کر دیتا ہے۔ بابو صاحب! ایک طرف ہماری فصل تباہ ہوئی۔ کھانے کے لئے گھر میں اناج نہ رہا دوسری طرف حاکم کے لئے روپیہ اکٹھا کرنے کے لئے ہم سے کہا۔ ہم سے یہ شرط پوری نہ ہو سکی۔ حاکم آ کر بہت غصہ ہوا۔ یونہی بہانہ بنا کر ہمارے نمبردار کو گالیاں دیں۔ اور دو تین چودھریوں کو بوٹ سے ٹھوکریں ماریں اور واپس جا کر اس نے لکھ دیا کہ اس گاؤں کی فصل

کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس لئے لگان معاف نہ کیا جائے۔ ہمارے کھیت آپ کے سامنے ہیں۔ دیکھ لیجئے۔ ان میں فصل نام کو نہیں۔ مگر سرکاری لگان ہمیں ادا کرنا ہی پڑیگا۔"

اس کے بعد پانچ چھ زمینداروں نے شکایتیں سنائیں۔ اور سب زمینداروں نے متفقہ طور پر مجھ سے درخواست کی کہ اس بے انصافی کا کوئی علاج ہونا چاہیئے۔

میں نے جواب دیا۔

"آپ کی تکلیفیں معلوم کر کے مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس نام نہاد ذمہ دار حکومت کے زمانہ میں کم از کم دیہات کے لوگوں سے حاکموں کا سلوک اچھا ہو گا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں سرکاری دفتروں میں ہم ماتحتوں کی حالت بھی آپ سے بہتر نہیں۔ ہماری تکالیف اور آپ کی تکالیف میں کوئی فرق نہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ تکلیفیں ہمیں خود اپنے ہی بھائیوں کے ہاتھوں پہنچ رہی ہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تمہارا وزیر اعظم ہندوستانی ہے۔ اور باقی وزیر ہندوستانی ہیں۔ ان کے سیکرٹری ہندوستانی ہیں۔ باقی سارے افسران سیکرٹریوں کے ماتحت ہیں۔ اگر افسروں کو پتہ ہو کہ زمینداروں سے ان کی سختی وزیر اعظم کو ناگوار گزرے گی اور وہ انہیں سزا دے گا۔ تو افسروں کو کبھی جرأت نہیں ہو سکتی کہ بیجا تمہیں تنگ کرے۔ افسر جانتے ہیں کہ وزیر اعظم کسی سیکرٹری

کے کام میں دخل نہیں دیتا۔ سیکرٹری اپنے ماتحتوں کے کام میں دخل نہیں دیتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو افسر جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اگر میں تم سے کہوں کہ اس خرابی کا باعث افسر نہیں بلکہ تم خود ہو۔ تو تم میری یہ بات مان لو گے۔"

آوازیں: "وہ کس طرح؟"

"تمہیں یاد ہو گا آج سے چند سال پہلے اسمبلی کا انتخاب ہوا تھا۔ اس میں تم نے کسی امیدوار کو ووٹ دیئے تھے؟"

آوازیں: "ہم نے ووٹ دیئے تھے۔ ہم نے خانصاحب ننھے خاں اور لالہ چھپت رائے کو ممبر بنوایا تھا۔"

"بس وہی ممبر تمہاری مصیبتوں کا باعث ہیں۔ وہ لوگ اسمبلی میں وزیر اعظم کی پارٹی کے ساتھ ہیں۔ اگر اس پارٹی کے کچھ ممبر وزیر اعظم کا ساتھ چھوڑ دیں تو وزیر اعظم۔ وزیر اعظم تو کیا وزیر بھی نہ رہ سکے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں۔ جب تمہارے ممبروں نے وزیر اعظم کی اتنی مدد کی ہے تو وہ کیوں نہیں اس سے کہتے کہ افسر زمینداروں پر ظلم کرتے ہیں۔ ان افسروں کو سزا دی جائے۔ کیا تم ننھے خاں اور چھپت رائے کو ممبر نہیں بنوایا تھا؟ پھر وہ کیوں تمہارا کہا نہ مانیں"

نمبردار: "وہ جب سے ممبر بنے ہیں۔ انہوں نے ہمیں دوبارہ شکل تک نہیں دکھائی۔ وہ بڑے آدمی ہیں۔ ان تک ہماری رسائی نہیں"

میں: "میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ اسمبلی کا انتخاب پھر قریب آ

رہا ہے سنتے خاں اور چمپت رائے دو تین مہینوں تک پھر تمہارے پاس آئیں گے ۔ تمہیں اپنے بھائی بنائیں گے ۔ تم سے میٹھی میٹھی باتیں کریں گے ۔ تمہیں کئی قسم کا لالچ دیں گے ۔ اگر تم نے ان کی بات نہ سنی تو وہ تمہیں پیسے بھی دینے پر تیار ہو جائیں گے ۔ تاکہ کسی نہ کسی طرح تم سے ووٹ لے کر وہ پھر اسمبلی کے ممبر بن جائیں ۔ یاد رکھو تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ یہاں سے ایسے ممبر اسمبلی میں بھیجو ۔ جو وزیر اعظم کو اس وقت چین نہ لینے دیں ۔ جب تک ظالم افسروں کو سزائیں نہ مل جائیں ۔ اگر تم صرف اتنا بات کر سکو تو تمہاری آئندہ زندگی بڑے آرام سے گزرے گی ۔"

ایک زمیندار :۔ بابو صاحب ! ہم ان پڑھ لوگ یہ باتیں کیا جانیں ۔ آپ نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں ۔ اب ہم کسی فریب میں نہیں آئیں گے ۔ ووٹ اسی امیدوار کو دیں گے جس کی ایمانداری پر ہمیں یقین ہو ۔ اور جو وزیر اعظم کو سیدھے راستہ پر چلا سکے ۔"

میں :۔ اگر تمہارے موجودہ ممبروں کو یقین ہو گیا تم انہیں آئندہ ووٹ نہیں دو گے ۔ تو ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں تنگ کرنا شروع کر دیں ۔ افسر ان کے دوست ہوتے ہیں ۔ شاید افسر بھی تمہیں ڈرائیں دھمکائیں ۔ تم خود جانتے ہو کہ تمہارے افسر بڑے ظالم ہیں ۔ اور کوئی جائز ترکیب ان کو ظلم سے باز نہیں رکھ سکتی ۔ پس افسروں کی ہاں میں ہاں ملاتے رہو ۔ اور وقت پر ووٹ اسی امیدوار کو دو جسے تم پسند کرو ۔"

دوسرا زمیندار ۔ آپ شہر میں رہتے ہیں ۔ آپ کیوں سیکرٹریوں اور وزیر اعظم کو نہیں سمجھاتے ؟ آپ خود ہماری مصیبتیں وزیر اعظم کے سامنے کیوں پیش نہیں کرتے ۔ آپ نے ابھی بتایا ہے کہ اسمبلی کا انتخاب ابھی چھ مہینے بعد ہوگا ۔ کیا اس سے پہلے کچھ نہیں ہو سکتا ؟

میں ۔ میں بتا چکا ہوں کہ صوبہ کے سارے افسر ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں ۔ جب تک انہیں سزا کا ڈر نہ ہو ۔ وہ انصاف نہیں کریں گے ۔ خود میں نے ایک بے انصافی کے سلسلے میں سیکرٹری سے ملاقات کرنی چاہی ۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک عجیب قسم کی رشوت لینے کا عادی ہے ۔ میں وہ رشوت نہیں دے سکتا تھا ۔ اس لئے میرا کام نہ ہوا پھر وزیر اعظم سے ملا ۔ اس نے کہہ دیا کہ چھوٹے لوگوں سے اگر بے انصافی ہو جائے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ۔ بڑی بات یہ ہے کہ سیکرٹری کے کام میں دخل نہ دیا جائے ۔ ان لوگوں سے ہمیں کسی بھلائی کی توقع نہیں ۔ انصاف حاصل کرنے کے لئے ہمیں چھ مہینے کے بعد موجودہ وزارت کو بدلنا پڑے گا ۔ اگر تم چاہتے ہو کہ اسمبلی کے انتخاب سے پہلے ہی تمہاری مصیبتیں دور ہو جائیں تو ایکا کر کے ابھی اپنے موجودہ ممبروں کو اطلاع بھجوا دو کہ آئندہ تم ان کو ووٹ نہیں دو گے ۔ وہ تمہارے پاس نہ آئیں ۔ پھر دیکھو وہ کیسے بھاگے بھاگے تمہارے پاس آتے ہیں ۔ ان سے پوچھو کہ زمینداروں کے لگان سے بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے افسر زمینداروں کو

کیوں تنگ کرتے ہو۔ اگر وزیراعظم ان افسروں کو قابو میں نہیں رکھ سکتا تو ہمارے نمائندے ہوتے ہوئے تم وزیراعظم کی پارٹی میں کیوں شامل ہو؟

آوازیں "ہم اپنے موجودہ ممبروں کو بھی بتا دیں گے کہ آئندہ ان کو یہاں سے ایک بھی ووٹ نہیں ملے گا۔"

اس کے بعد میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنے آپ کو گیارہ گیارہ کے گروہ میں تقسیم کریں۔ ہر گروہ میں ایک ایک نگران چن لیں۔ پھر سارے نگران اکٹھے ہوں اور ہر گیارہ نگران اپنے میں سے ایک ناظم منتخب کرلیں۔ اسی طرح ہر گیارہ ناظم اپنے میں سے ایک عامل چن لیں اور عامل ہماری مرکزی انجمن کا رکن ہوگا۔ تمہیں جو تکلیف ہو اسے نگران سے کہو نگران اپنے ناظم کو بتائے اور ناظم سارا معاملہ عامل کو سمجھا دے۔ تاکہ عامل اسے مرکزی انجمن تک پہنچا دے۔ موضع گجرام میں سو سے زیادہ زمیندار تھے۔ انہوں نے اسی وقت انتخاب کرکے نگران اور ناظم چن لئے میں نے مرکزی انجمن کے اغراض و مقاصد ان کو بتائے۔ اور مرکزی انجمن کو یہاں کی کاروائی بھیج دی۔

نمبردار کو ساتھ لے کر میں دوسرے گاؤں پہنچا۔ وہاں کے حالات کے مطابق اس کے رہنے والوں سے گفتگو کی۔ اور وہاں بھی انجمن کی شاخ قائم کردی۔ وہاں سے ایک آدمی کو ساتھ لے کر ایک اور گاؤں میں گیا۔ اور اسی طرح سلسلہ جاری رہا۔ یہاں

تک کہ ابھی میری رخصت میں ایک ہفتہ باقی تھا کہ میں نے اسی سے زیادہ دیہات کا دورہ کر لیا۔ اور ہر جگہ انجمن کی شاخ پیدا کر دی جس گاؤں میں برانچ قائم ہو جاتی۔ وہاں کے لوگ شوق سے دوسرے دیہات میں جاتے اور خود بخود نئی شاخیں پیدا کرنے کی جدوجہد کرتے۔ اسی طرح چند ہی دن میں صوبہ کے اندر سینکڑوں شاخیں قائم ہو گئیں۔ اور عامل مرکزی انجمن کو دیہات کے معاملات سے باخبر رکھنے لگے۔ میں نے مرکزی انجمن کو لکھ دیا کہ وہ بہت جلد ایک کانفرنس منعقد کرنے کی تیاری کرے۔ جس میں دیہات کے عالموں کو شامل کیا جائے۔ اور آئندہ پروگرام طے ہو۔

میں اپنے سفر کے دوران میں ہر ہفتہ ادشا کو خط لکھتا رہا۔ اور اُسے دیہات کے حالات سے پوری طرح آگاہ کرتا رہا۔ پہلے دو خطوں کے جواب میں اس کا ایک خط ملا۔ جس میں وہی پرانا شکوہ دہرایا ہوا تھا۔ کہ میں اس کا سیکرٹری بننا کیوں پسند نہیں کرتا۔ اس نے پوچھا تھا۔ کہ کیا ابھی تک میں اپنی ضد پر قائم ہوں یا اب راہ پر آگیا ہوں۔ اس کے علاوہ اس نے لکھا کہ گذشتہ ہفتہ اس نے نیشنل ہال میں ایک پھر تقریر کی۔ جس میں دیہات کے متعلق میرے پروگرام کا بھی ذکر کر دیا۔ اور حاضرین نے دو مرتبہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر زندہ باد بشیر! کے نعرے لگائے۔ نیز یہ کہ اس نے اس کھلے اجلاس میں ایک قرارداد خود اپنی طرف سے پیش کی کہ صوبہ کے نوجوانوں کو چاہئے وہ سول تیج

کو رواج دیں تاکہ ہندو مسلم اتحاد زیادہ پختہ ہو جائے۔ اس نے لکھا کہ نوجوانوں نے اس قرار داد کو متفقہ طور پر منظور کر لیا۔ مگر بعض اخبارات اس پر بڑی نکتہ چینی کر رہے ہیں۔

ایک خط!

میں نے مناسب سمجھا کہ اوشا کی چٹھی کا جواب اپنا دورہ ختم کر کے واپس روانگی سے دو تین دن پہلے لکھوں تاکہ اسے یہ خوشخبری اسی خط کے ذریعے پہنچ جائے کہ میرا دورہ بہت کامیاب رہا ہے۔ اور دیہات حیرت انگیز تیزی کے ساتھ منظم ہو گئے ہیں۔ اتنے میں ایک خط ریاض آباد سے منحوس خبر لایا۔ یہ خط اشرف کی طرف سے تھا اس نے لکھا تھا۔

پیارے دوست!

آپ کے نام یہ میرا پہلا خط ہے اور اسی خط میں ایک بُری خبر سنا رہا ہوں۔ کل میرے ہاں چوری ہو گئی۔ چالیس ہزار روپے کے نوٹ جاتے رہے۔ ایک خاص وجہ سے جس کا ذکر میں زبانی کرونگا۔ کرافرڈ موٹر کمپنی کے حصے یکایک بہت سستے ہو گئے تھے۔ میں نے مناسب

سمجھا کہ جتنا روپیہ بنک میں جمع ہے۔ اسے نکلوا کر کمپنی کے حصے خرید لوں۔ بنک سے شام کے وقت روپیہ نکلوایا۔ کمپنی کے دفتر تک پہنچا۔ اس روز اسے جمع کرانے کا وقت گزر چکا تھا۔ روپیہ گھر لانا پڑا۔ کوئی بھیدی ہاتھ کو سارے کا سارا روپیہ لے کر چلتا بنا۔ پولیس کو اطلاع دے دی ہے تفتیش ہو رہی ہے۔ مگر رقم کا ملنا محال ہے مجھے اپنے روپیہ کا افسوس نہیں وقت درکار ہے۔ میں روپیہ اور پیدا کر لوں گا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اب آپ کی سکیم کے لئے میری طرف سے مدد کی صورت باقی نہیں رہی۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میری تجویز ہے کہ آپ اپنی زمین بیچ کر اس وقت پانچ ہزار روپیہ پیدا کریں۔ میں اسی وقت آپ کو کمپنی کے حصے خرید دوں گا۔ ہم کمپنی کے بھیدی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ دو ہی مہینے میں اس کے حصوں کی قیمت دس گنا ہو جائے گی پھر آپ یہ حصے فروخت کر کے پچاس ہزار روپیہ سے اپنی سکیم کو کامیاب کر سکتے ہیں۔ یہ موقع زیادہ سوچ بچار کا نہیں۔ اگر آپ کو میری رائے سے اتفاق ہو تو روپے کا بندوبست کر لیجئے۔ ورنہ آپ مالک ہیں۔ میرا زیادہ فکر نہ کیجئے جس خدا نے پہلے دیا تھا وہ اب بھی دیگا۔

آپ کا صادق

اشرف

مجھے اشرف کا خط پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ اس کے ساتھ غصہ بھی آیا۔ افسوس اس لئے ہوا کہ اس کا وہ روپیہ جو میری سکیم پر خرچ ہونا چاہئے تھا۔ عین اس وقت چوری ہوا جب کہ اس کی ضرورت پڑنے والی تھی۔ اور ضرورت بھی وہ جو صوبہ میں ایک بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ تھی۔ غصہ اس لئے آیا کہ اشرف کو یہ ضرورت ہی کیا تھی۔ کہ روپیہ بنک سے نکلوا کر کمپنی کے دفتر میں لے جاتا۔ کیوں نہ چیک کاٹ کر کمپنی کے حوالے کیا؟ روپیہ اس کے حساب میں سے کمپنی کے حساب میں منتقل ہو جاتا۔ نالائق کہیں کا۔ بڑا بنا پھرتا ہے۔ چالیس ہزار روپیہ گنوا بیٹھا۔ بڑے آدمیوں کی غلطیاں بھی بڑی ہوتی ہیں۔

پھر خیال آیا۔ میں کتنا خود غرض ہوں اور مطلب پرست۔ یہ سوچا ہی نہیں کہ ڈاکٹر ثریا سے اشرف کی شادی ہونے والی تھی۔ ہر چند کہ ڈاکٹر ثریا کو روپے کی ضرورت نہیں۔ اشرف شادی کے اخراجات کہاں سے پورے کریگا۔ بیچارہ کہیں اِدھر اُدھر سے قرض لے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے میرا بوجھ اٹھانا نہیں چاہا۔ ورنہ وہ اس حالت میں بھی پانچ ہزار روپیہ کسی دوست سے دست گردان لے سکتا تھا۔

میں نے قلم اٹھایا اور اسی وقت ہمدردی کا خط اشرف کو لکھ دیا ساتھ ہی میں نے بغیر سوچے سمجھے یہ لکھ دیا کہ میں آج ہی اپنے گاؤں کو روانہ ہو رہا ہوں۔ اگر کوئی خریدار مل گیا۔ تو زمین کا نیا یا پچہ کر کے فوراً

روپیہ حاضر کر دوں گا۔

خط ڈاک میں ڈال دینے کے بعد مجھے خیال آیا کہ گاؤں میں آدمی کی عزت زمین سے ہے جس کے پاس زمین نہیں وہ چوہڑے چمار کے برابر ہے ۔ لوگ اپنی پیدا کی ہوئی زمین کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں ۔ اور اس کے چپّے چپّے کے لیے لڑ مرتے ہیں ۔ میری زمین تو باپ دادا کی پیدا کی ہوئی ہے ۔ جس کے ساتھ خاندانی عزت بھی وابستہ ہے ۔ میں اپنی کمائی سے خود اس زمین میں اضافہ نہیں کر سکا ۔ اب باپ دادا کا ورثہ بیچوں گا تو دنیا کیا کہے گی ۔ گاؤں کے لوگ کیا کہیں گے ۔ کیا میں پھر گاؤں کو منہ دکھا سکوں گا ؟ گاؤں کے لوگ یہی سمجھیں گے کہ جہاں اور بعض نیچ ذات لوگ گاؤں میں بستے ہیں ۔ وہاں بشیر بھی ہے یہ صورت ناقابل برداشت ہوگی ۔ اپنے ہاتھوں باپ دادا کا نام نہیں ڈبویا جاتا ۔ پھر میں نے اس مسئلہ کو ایک اور زاویہ سے دیکھا ۔ باپ دادا کی عزت اس صورت میں ڈوبتی ہے ۔ کہ میں زمین کو بیچ کر روپیہ عیاشی کی نذر کر دوں مجھے کوئی بری عادت نہیں میں فضول خرچ نہیں ۔ روپیہ ایک نہایت نیک مقصد کے لئے درکار ہے ۔ ایک طرف صوبہ کی بہبودی اور وزیر اعظم کا عہدہ اور دوسری طرف یہ چند گھماؤں زمین ۔ ان دو کا مقابلہ ہی کیا ۔ زمین بھی سرمایہ ہے ۔ سرمایہ اگر ضرورت کے وقت کام نہ آئے ۔ تو اس کا کیا فائدہ ! اور میری موجودہ ضرورت سے بڑی کوئی ضرورت نہیں ہو سکتی پس

اپنے دل سے مجھے جھوٹی عزت کا خیال نکال کر زمین بیچ دینی چاہیئے۔ چلو
ہم اسے رہن کر دیں گے۔ تاکہ پھر چھڑائی جاسکے۔ لیجئے مسئلہ حل ہو گیا۔ روپیہ
کی ادائیگی پر ہمیں اس کا واپس مل جانا بھی ممکن رہے گا۔ اور موجودہ ضرورت
بھی پوری ہو جائے گی۔ صبح کی گاڑی سے میں اپنے گاؤں کو روانہ
ہو گیا۔ آٹھ دس دیہات کا دورہ باقی تھا۔ وہ میں نے منسوخ کر دیا
گاؤں میں ہر شخص مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا۔ خوب خوش گپیاں
ہوئیں۔ ہم عمروں سے ہنسی مذاق ہوا۔ اور باتوں ہی باتوں میں انجمن
کی شاخ بھی قائم ہو گئی۔ لمبی چوڑی تمہید۔ دل کے بعد میں نے اپنی
زمین رہن رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ کیا بوڑھے اور کیا جوان سب سنجیدہ
ہو گئے اور رنگ رنگ کی نصیحتیں کرنے لگے۔ میں نے سب کچھ ایک
کان سنا اور دوسرے کان نکال دیا۔ بڑی بک بک کے بعد ایک
خریدار مل گیا۔ قریب کے شہر میں جا کر رجسٹری کرا دی۔ اور پانچ ہزار
روپیہ پلے باندھ اس سے اگلے دن میں ریاض آباد پہنچ گیا۔
اشرف سے دوستی ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ مگر میں ایک دفعہ
بھی اس کے مکان پر نہ گیا تھا۔ اس نے اپنے مکان کا پتہ کئی دفعہ
بتایا۔ مگر مجھے کبھی پوری طرح یاد نہ رہا۔ کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ اب
جبکہ مجھے اس سے مل کر اس کے چالیس ہزار روپیہ کے نقصان پر
اظہار ہمدردی کرنا تھا۔ اور پانچ ہزار روپیہ بھی اسے دینا تھا۔ لازم
تھا کہ میں اس کے گھر جاتا۔ میں نے ریاض آباد ریلوے سٹیشن سے

اترتے ہی ارادہ کر لیا تھا کہ اپنے کوارٹر میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد اس کے مکان کی تلاش میں نکلوں گا۔ مگر مجھے یہ زحمت نہ اٹھانی پڑی میں ابھی اپنے کوارٹر میں پہنچا ہی تھا۔ کہ اشرف خود وہاں آدھمکا۔ مجھے اس بات پر سخت تعجب ہوا کہ جب بھی مجھے اس کی ضرورت ہوتی ہے یہ کہیں نہ کہیں سے ادھر آنکلتا ہے۔ میں نے چوری کی واردات پر اس سے اظہار ہمدردی کیا۔ اور پانچ ہزار روپیہ کے نوٹ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"اپنے باپ دادا کی عزت بیچ کر یہ رقم لایا ہوں"۔
وہ میرے شانوں پر تھپکی دیتے ہوئے بولا۔

"ایسا نہ کہو۔ یہ رقم آپ کے باپ دادا کا نام روشن کرنے کا ذریعہ بنے گی"۔

اس نے بتایا کہ کمپنی کے بہت تھوڑے حصے باقی رہ گئے ہیں باقی سب فروخت ہو چکے ہیں۔ اس لئے اسے فوری کارروائی کرنی چاہیئے۔ تاکہ باقی حصے بھی بک نہ جائیں۔ وہ بڑی پھرتی سے اٹھا اور روپیہ لے کر چلا گیا۔

میں طویل دورہ کی تھکاوٹ اور فروخت زمین سے پیدا شدہ ذہنی پریشانی کے باعث بہت مضمحل ہو گیا تھا۔ میری رخصت کے ابھی دو دن باقی تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ایک پورا دن اپنے کوارٹر ہی میں آرام کروں۔ دوسرے دن اوشا سے ملوں اور تیسرے

دن دفتر میں حاضر ہو جاؤں ۔

رات بڑے سکون کی نیند آئی ۔ اور صبح میں نے اپنے آپ کو بالکل تر و تازہ پایا ۔ ناشتہ کر کے کپڑے پہنے اور ادشا سے ملاقات کے لئے جانے کو ارٹر سے نکلا ۔ قدم خود بخود دفتر کی طرف اٹھنے لگے ۔ اور مجھے بار بار خیال آنے لگا ۔ کہ پہلے ڈاکٹر ثریا سے چند منٹ ضرور مل لینا چاہئے ۔ اس کے متعلق جلدی میں اشرف سے کچھ نہ پوچھ سکا تھا ۔ ممکن ہے وہ خود ہی بتا دے کہ ان کی شادی کب ہونے والی ہے ۔ خیالات میں الجھا ہوا میں دفتر میں پہنچا ۔ میری جگہ کام کرنے والا کلرک ابھی نہ آیا تھا ۔ اسسٹنٹ لیڈی ڈاکٹر موجود تھی ۔ لیڈی ڈاکٹر سے ملا ۔ اس نے رسمی طور پر پوچھا کہ میری رخصت کیسی کٹی ۔ میں نے کہہ دیا کہ بڑی جگہوں کی سیر کی ۔ کئی رشتہ دار دل اور بھولے بسرے دوستوں سے ملا ۔ اب میری صحت پہلے سے بھی اچھی ہے دفتر کا کام خوب کر سکوں گا ۔

میرا دل ڈاکٹر ثریا کو دیکھنے کے لئے بہت بیتاب ہو رہا تھا ۔ بہت ضبط کیا ۔ آخر منہ سے نکل ہی گیا ۔

" ڈاکٹر ثریا کب تک تشریف لائیں گی ؟ "

لیڈی ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا ۔

" ڈاکٹر ثریا ! تمہیں معلوم نہیں ؟ کوئی پندرہ دن ہوئے ان کی شادی ہو گئی اور اسی دن وہ اپنے شوہر کے ساتھ ماہ عسل منانے کے لئے کوہ امادس چلی گئیں ۔ وہ دو مہینے کی رخصت پر ہیں ۔ ابھی ڈیڑھ مہینہ

کے بعد واپس آئیں گی۔"

اس خبر سے میرے دل کو دھکا سا لگا۔ میں نے مضطرب ہو کر دریافت کیا۔

"ان کی شادی کس سے ہوئی ہے؟"

لیڈی ڈاکٹر نے بڑی تیزی سے مجھے گھور کر دیکھا اور میرے چہرہ پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

"یہاں کے ایک مالدار کاروباری آدمی مسٹر اشرف خاں سے۔"

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"آپ کہتی ہیں۔ وہ میاں بیوی کوہ آباس چلے گئے ہیں۔ حالانکہ اشرف مجھے کل یہیں ریاض آباد میں ملا ہے۔"

لیڈی ڈاکٹر نے اور بھی تعجب کی نگاہ سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا

"تم مسٹر اشرف کو جانتے ہو؟"

میں نے اپنی غلطی محسوس کی۔ اپنے پہلے فقرہ کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ میں اشرف صاحب کو پہچانتا ہوں۔ وہ اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ میں بھی یہیں رہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے جسے کل میں نے اشرف سمجھا۔ وہ دراصل کوئی اور ہو۔ میری نظر نے دھوکا کھایا ہو۔"

اشرف کے متعلق میرے دل میں ایک لمحہ کے لئے شبہ سا پیدا ہوا

جیسے فوراً ہی حسن ظنی نے اپنے میں جذب کرلیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ اشرف کتنا بے نظیر دوست ہے۔ ماہِ عسل کی مسرتوں میں بھی میری سکیم کو نہیں بھولا۔ پتہ نہیں ثریّا سے وہ کیا بہانہ کرکے آیا ہوگا۔ تاکہ میرے لئے کمپنی کے حصّے خرید سکے۔ ایسے نیک آدمی کو میں کیا اجر دے سکتا ہوں اسے خدا ہی جزا دے گا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اس نے مجھے کیوں لکھا تھا۔ وہ میری سکیم کے لئے مالی امداد نہیں دے سکتا۔ بیچارا اشرف۔ چالیس ہزار روپیہ لٹ جانے کے بعد بیوی اور وہ بھی ثریّا جیسی فیشن کی دلدادہ بیوی کے اخراجات کو نبھانا کوئی آسان کام نہیں۔ مجھے وہ صاف جواب نہ دیتا تو کیا کرتا۔ یہ تو خیریت گذری کہ اس کے ہاں چوری شادی کے بعد ہوئی۔ اگر شادی سے پہلے چوری ہوتی۔ تو پتہ نہیں وہ ثریّا سے شادی بھی کرسکتا یا نہیں۔

میں نے خیال کیا کہ پھر بھی اشرف کو شادی پر مجھے ضرور مدعو کرنا چاہیئے تھا۔ میں مانتا ہوں میرا دورہ بہت ضروری تھا۔ لیکن اشرف رسماً ہی دعوتی خط لکھ دیتا۔ میں آتا یا نہ آتا۔ یہ جُدا بات تھی۔ میں نے نتیجہ نکالا۔ کہ غالباً اپنی اسی غلطی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے کل مجھ سے شادی کا ذکر نہیں کیا۔ اب اسے آنے دو نہ جئے۔ آڑے ہاتھوں لوں گا۔"

میں اور اوشا

ہسپتال سے روانہ ہو کر میں سیدھا اوشا کے بنگلہ پر پہنچا۔ اطلاع ملتے ہی اوشا خود میرے استقبال کے لئے آئی۔ اور مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ میں چند ہی منٹ میں اُسے اپنے دورہ کے متعلق سب کچھ بتا چکا تھا دیہات کے متعلق اسے معلومات بہم پہنچاتے ہوئے میں نے کہا۔

" دیہات کی زمیندار آبادی کو صوبہ کی سیاسیات سے کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔ بادشاہ مرے یا جیئے۔ صوبہ پر ایک آدمی کی حکومت ہو یا اسمبلی کی انہیں اس سے غرض نہیں۔ ان لوگوں کی سلطنت ان کے کھیت ہیں اور مویشی ان کی رعایا۔ وہ اپنے ماحول میں خود بادشاہ ہیں۔ انہیں اصل بادشاہ سے نہ دشمنی ہے نہ دوستی۔ افسران پر ظلم کرتے ہیں۔ رشوت لیتے لیتے ان کا خون تک چوس جاتے ہیں۔ اس پر بھی وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ وہ جاہل ہیں۔ اَن پڑھ ہیں۔ جو بات ایک دفعہ ذہن میں بیٹھ گئی۔ وہ پھر نہیں نکلتی۔ انہیں بیدار کرنا اور اپنے حقوق کا احساس دلانا بہت مشکل ہے۔ لیکن اگر وہ ایک دفعہ بیدار ہو جائیں۔ انہیں اپنے حقوق حاصل کرنے کا خیال پیدا ہو جائے۔ تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں ناکام نہیں کر سکتی۔ اور نہ انہیں دبایا جا سکتا ہے میرے دورہ پر وہ لوگ

کچھ چونکے ہیں۔ عجب نہیں کسان کا چونکنا صوبہ کا سیاسی حلیہ بدل دے۔"

اوشا نے جواب دیا۔

"ہم ان لوگوں کی پوری پوری مدد کریں گے۔ اسمبلی کے آئندہ انتخاب میں ہماری انجمن پورا حصہ لے گی۔"

میں:" اسمبلی کے انتخاب میں بھی آپ اس انجمن کی صدر ہوں گی اور میں آپ کے نائب کی حیثیت سے کام کروں گا۔"

اوشا:" صوبہ کی دیہاتی آبادی نوے فی صدی ہے۔ اور اس کی تنظیم آپ کر رہے ہیں۔ شہری آبادی دس فیصدی ہے وہ بھی پوری منظم نہیں۔ اس صورت میں مجھے آپ کے ماتحت کام کرنا چاہیے یا آپ کو میرے ماتحت؟"

میں:" اگر یہ بات ہے تو میری رائے آپ کی لئے سے زیادہ وزنی ہونی چاہیے۔"

اوشا (مسکرا کر):" بیشک"

میں:" پھر میری رائے ہے کہ اس وقت بھی آپ ہی صدر بنیں۔"

اوشا ہنس پڑی۔ اس نے مجھے بتایا کہ کانفرنس کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ اس کی تاریخ بھی مقرر ہو چکی ہے۔ اس میں صرف دو ہفتے باقی ہیں۔ اس تاریخ کی اطلاع عاملوں کے ذریعہ دیہات کے ہر گوشہ میں پہنچا دی گئی ہے۔ کانفرنس کا پنڈال رانی باغ میں ہوگا۔ نیشنل ہال اس مقصد کے لئے ناکافی خیال کیا گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ

دیہات کے تمام نگران، ناظم اور عامل اس کانفرنس میں شریک ہوں گے اس طرح گویا سارا دیہاتی صوبہ یہاں موجود ہوگا۔ شہر سے تیس چالیس ہزار کا مجمع تو یہی تقریر پر بھی ہو جایا کرتا ہے۔ اس موقع پر لازمی طور پر مجمع بہت زیادہ ہوگا۔ یہ کانفرنس ہر لحاظ سے تاریخی کانفرنس ہوگی۔

کانفرنس کا پروگرام ابھی آخری طور پر طے نہیں ہوا تھا۔ اس کی اشاعت میری غیر حاضری کی وجہ سے روک لی گئی تھی۔ میں نے مجوزہ پروگرام سرسری طور پر پڑھا۔ اسے اپنے خیالات کے مطابق پایا۔ اس میں موجودہ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد بھی موجود تھی۔ اس قرارداد کی تائید میں جن لوگوں نے تقریر کرنی تھی۔ ان میں میرا نام بھی درج تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ پروگرام درست ہے۔ لیکن مجھے سٹیج پر تقریر کرنے کے لئے نہ بلایا جائے تو بہتر ہوگا۔ اوشا نے ناراض ہو کر کہا۔

"یہ کبھی نہ ہوگا۔ آپ کو سٹیج پر آنا پڑیگا۔"

یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں سرکاری ملازم ہوں۔ اس تحریک میں نمایاں طور پر حصہ نہیں لے سکتا۔ میں خاموش ہو گیا۔

اوشا نے مجھے بتایا کہ میری غیر حاضری میں اس نے نوجوان تحریک کے سلسلے میں کیا کچھ کیا۔ اور ہندو مسلم اتحاد کے متعلق کون کونسی تدبیریں سوچیں۔ اس نے کہا کہ سول میرج کو رواج دینے سے ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد پختہ ہو سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہندو مسلمانوں سے شادی کریں اور مسلمان ہندوؤں سے۔ پھر اس نے جھینپتے ہوئے پوچھا۔

"اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟"

میں نے عرض کر دیا کہ میں اس کے خیال سے متفق ہوں۔ اس پر اوشا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور وہ یکدم میرے سامنے سے اُٹھ کر دیوار سے لٹکتی ہوئی ایک تصویر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

اوشا نے مجھے تاکید کی کہ کانفرنس کے انعقاد تک میں ہر دوسرے روز اس سے ملتا رہوں۔ میں نے اس کا وعدہ کر لیا۔

اوشا کے بنگلہ سے نکل کر مجھے خیال آیا کہ اشرف کا گھر تلاش کرنا چاہیئے۔ اگر وہ آج شام تک میرے کوارٹرمیں نہ آئے۔ تو میں اس کے مکان پر جا کر اسے ملوں۔

طوفان

اشرف شام تک میرے کوارٹر میں نہ آیا۔ میں اس کے مکان کا پتہ پوچھتے پوچھتے اس سے ملنے کے لئے روانہ ہوا۔ اس کا مکان تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دقت نہ ہوئی۔ اس کا مکان ایک چھوٹا سا خوبصورت بنگلہ تھا۔ جسے اشرف کی غیر شاعرانہ شکل وصورت سے کوئی نسبت نہ تھی۔ احاطہ کے دروازہ پر نوکر موجود نہ تھا۔ میں آگے بڑھ کر ڈیوڑھی تک پہنچ گیا۔ نوکر سے کہا۔ میں اشرف صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس

نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور کشمکش میں پڑ گیا۔ میں نے ذرا زور دیتے ہوئے کہا۔

"اشرف صاحب میرے دوست ہیں۔ ان سے کہہ دیجئے ہسپتال کا کلرک ملنے آیا ہے۔"

نوکر کچھ کہنے ہی کو تھا کہ دائیں بغل والے کمرہ سے ایک گرج دار آواز آئی۔

"اسے پکڑو۔ یہ جانے نہ پائے۔ میں ابھی آیا۔"

ایک دوست کے گھر میں میرے استقبال کا یہ انداز مجھے پریشان کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں گھبرا گیا۔ اتنے میں ایک بوڑھا آدمی شکل سے اشرف کا منشی برآمد ہوا۔ اس کے خط و خال پکار رہے تھے کہ وہ اشرف کا باپ ہے۔ اس لئے اس کے متعلق مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہی۔ اس نے آتے ہی کہنا شروع کیا۔

"تم ہی ہسپتال کے کلرک ہو، تم ہی خبیث اشرف کے دوست ہو آج تم یہاں سے زندہ نہیں جاؤ گے۔ ابھی دو منٹ میں تمہاری نعش تڑپتی ہوگی۔ تمہاری موت تمہیں ادھر گھسیٹ لائی ہے۔ اشرف آوارہ ہے۔ جوا کھیلتا ہے۔ شراب پیتا ہے۔ اس نے میری جائداد تباہ کی۔ میری عزت برباد کی۔ مجھے کہیں منہ دکھانے کا نہ چھوڑا۔ تم لوگ اس کے شریک کار ہو۔ تم خود بدمعاش ہو اور اس کی بدمعاشیوں میں شریک ہوتے ہو اسے خراب کرتے ہو۔ خود خراب ہوتے ہو۔ اب تم لوگوں نے لیڈی ڈاکٹر

کو بھی اپنے ٹولہ میں شریک کر لیا ہے۔ تم لوگوں کی حرکتیں میری گی داشت سے باہر ہو چکی ہیں۔ "نانجو! لانا میری بندوق اندر سے۔ آج ایک کو ٹھکانے لگاؤں۔"

نوکر دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اشرف کے باپ نے اس پر ایک ایسی قہر آلود نظر ڈالی۔ کہ بیچارا تا جو سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ اور اپنے آقا کا حکم نہ ماننے کی اس میں جرأت نہ رہی۔ بندوق لینے کے لئے وہ اندر گیا۔ میرے ادسان خطا ہو رہے تھے۔ میں نہ بھاگ سکتا تھا۔ نہ مجھ میں کھڑا رہنے کی طاقت تھی۔ میں نے اشرف کے باپ سے کہا۔

"اشرف مجھ سے پانچہزار روپیہ لے کر میرے لئے کرافرڈ موٹر کمپنی کے حصے خریدنے گیا تھا۔ میں اس اشرف سے ملنا چاہتا ہوں۔ جو موٹر کمپنی کا کمشن ایجنٹ ہے۔ وہ بڑا شریف آدمی ہے۔ ابھی چند دن ہوئے اس نے ڈاکٹر ثریا سے شادی کی ہے۔ حال ہی میں اس کے چوری ہو گئی تھی۔ چالیس ہزار روپیہ نقد جاتا رہا معلوم ہوتا ہے۔ کسی نے غلطی سے مجھے آپ کے مکان پر بھیج دیا ہے۔ مجھے اشرف سے ملنا ہے۔ آپ سے مجھے کوئی علاقہ نہیں۔ آپ خواہ مخواہ مجھ پر رعب جما رہے ہیں۔ شکل وصورت سے آپ شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر آپ بڑے بھونڈے اخلاق کی نمائش فرما رہے ہیں۔"

اشرف کا باپ "تم نے پانچ ہزار روپیہ کہاں سے لیا اور اشرف

کو وہ کب دیا ہے؟

بیں :- میں رخصت پر تھا۔ اشرف نے مجھے لکھا کہ موٹر کمپنی کے حصے سستے ہو گئے ہیں۔ عنقریب پھر مہنگے ہونے والے ہیں۔ میں اپنی زمین بیچ کر وہ حصے خرید لوں۔ بہت جلد پانچ ہزار کے پچاس ہزار بن جائیں گے۔ ابھی کل صبح میں نے اسے روپیہ دیا ہے "

اشرف کا باپ (نرم ہوتے ہوئے) "تم پہلے آدمی نہیں ہو جس کو اس نے لوٹا ہے۔ اس کا یہی پیشہ ہے موٹر کمپنی کا کمشن ایجنٹ ؟ اشرف کو موٹر کمپنی میں کوئی چپڑاسی کی آسامی بھی نہ دے۔ جس اشرف کی تمہیں تلاش ہے۔ وہ میرا ہی لڑکا ہے۔ اب جا کر آرام سے بیٹھو۔ جب تک تمہارے پانچ ہزار وہ خرچ نہیں کر لیتا۔ اشرف کسی انسان کو نظر نہیں آئے گا۔ اور اگر وہ تمہیں مل جائے اور تم اسے گولی مار کر ٹھنڈا کر دو تو میں بہت خوش ہونگا"

نوکر اندر سے بندوق لے آیا تھا۔ مگر دور کھڑا رہا۔ کہ آقا اس کی طرف نہ دیکھے تو اچھا۔ اس کا آقا بندوق کا خیال بھول چکا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"مگر ڈاکٹر ثریا! وہ تو بہت معزز خاتون ہے۔ کیا اشرف نے اسے بھی چکمہ دیا ہے؟"

اشرف کا باپ :- اُسے اشرف نے کہہ دیا ہوگا کہ وہ گورنر کا سیکرٹری ہے اور آپ کی لیڈی ڈاکٹر نے یقین کر لیا ہوگا۔ دنیا میں احمقوں کی

کمی نہیں تم بھی احمق اور ڈاکٹر ثریا بھی احمق۔ ڈاکٹر ثریا کے پاس کچھ روپے ہونگے۔ جب اشرف اس کے روپے اللوں تللوں میں اڑا دیگا تو پھر وہ کوئی اور سبز شاخ تلاش کر لیگا۔ وہ ہری چُگ ہے۔"

ایک کلرک جس کی تنخواہ بارہ چودہ سال کے بعد ساٹھ روپے تک پہنچی ہو۔ پانچہزار روپیہ اس کے لئے کتنی بڑی رقم ہے۔ پھر اگر یہ رقم باپ دادا کی تمام پونجی بیچ حاصل کی گئی ہو۔ تو اس بیخاندانی وقار کی قیمت شامل ہوکر اسے اور بھی گراں بنا دیتی ہے۔ میں واپسی پر بار بار سوچ رہا تھا کہ اشرف لے لوٹنے کے لئے آخر مجھے ہی کیوں منتخب کیا ہ میں نے کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ پھر دشمن تو دشمن دوست بھی کیوں میرا ہی گلہ کاٹتے ہیں۔ میرا روپیہ اگر چور یا ڈاکو لے جاتے تو اتنا صدمہ نہ ہوتا۔ جتنا ایک دوست کے ہاتھوں لٹنے سے ہوا معاملہ کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر میں نے اس فریب دہی کی اطلاع پولیس کو دی تو نتیجہ اس کا کچھ نہیں نکلے گا۔ میرے محکمہ میں بڑے بڑے افسر بے ایمان موجود ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ پولیس کا محکمہ جو ویسے ہی اس سلسلہ میں بدنام ہے سو فیصدی بددیانت نہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ پولیس اشرف سے اپنا حصہ وصول کرکے چھوڑ دے گی۔ ادھر مجھے بار بار پولیس تھانہ میں جانا پڑیگا۔ اور انجام کار ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ اس سے یہی بہتر ہے کہ بھول کر بھی ادھر کا رُخ نہ کیا جائے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ

ڈاکٹر ثریا کو ایک چٹھی لکھی جائے۔ ثریا عورت ہے۔ عورتیں طبعاً نرم دل ہوتی ہیں۔ ثریا کبھی یہ گوارہ نہیں کرے گی کہ اس کا شوہر مجھ بے قصور کو یوں لوٹ لے۔ اس طرح رقم کا کوئی حصہ واپس مل جائے تو مل جائے دوسری کوئی صورت نہیں۔ میں نے لکھا۔

محترمہ ڈاکٹر ثریا!

مجھے اپنی زندگی میں یہ پہلا خط آپ کے نام لکھنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میرا یہ خط آپ کی شادی خانہ آبادی پر میری طرف سے صرف مبارکباد پیش کرتا اور اس میں میری کوئی ذاتی عرضداشت نہ ہوتی مگر قدرت کے کھیل ہیں۔ اپنے دوست اشرف خاں کے مشورہ پر میں نے اپنے باپ دادا کی زمین بیچ کر پانچ ہزار روپیہ انہیں دیا کہ وہ میرے لیے کرافرڈ موٹر کمپنی کے حصے خرید لیں۔ اس کے بعد اشرف خاں کی زیارت نہیں ہوئی۔ مجھے موٹر کمپنی کے حصے نہیں خریدنے۔ ازراہِ کرم اشرف صاحب سے میرا روپیہ لے کر ارسال فرما دیجئے ساری عمر آپ کا ممنونِ احسان رہونگا۔ آپ جانتی ہیں میں ایک معمولی کلرک ہوں۔ میرے لیے یہ رقم بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اشرف صاحب سیٹھ آدمی ہیں۔ انہیں ایسی حقیر رقم کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے مجھے آپ کے خط کا انتظار

رہے گا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ آپ کی شادی ایک کامیاب شادی ثابت ہو۔

نیاز مند

بشیر

میں نے اپنے ہیڈ آفس میں ٹیلیفون کر کے پتہ کیا کہ ڈاکٹر ثریا محکمہ کو اپنا کونسا ایڈریس دے گئی ہیں۔ جس پر انہیں ڈاک بھیجی جایا کرے۔ یہ ایڈریس کوہ اماس کا تھا۔ میں نے اسی پر خط ارسال کر دیا۔ میں نے دفتر سے پندرہ دن کی اور رخصت لے لی تاکہ کانفرنس کی تیاری میں پورا حصہ لے سکوں۔

اُف رے دُنیا!

کانفرنس کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ میں ہر روز اوشا کے یہاں جاتا اور انجمن کی ڈاک دیکھتا۔ میں انجمن کا سیکرٹری نہ تھا بلکہ اس کا معمولی رکن بھی نہیں تھا۔ لیکن دیہات سے جتنی چٹھیاں انجمن میں آتیں۔ ان سب میں میرا ذکر ہوتا۔ اس لیے ان کے جواب مجھے ہی لکھنے پڑتے۔ ان سے دیہات کے حالات اور اپنی روز افزوں ترقی مجھ پر آئینہ ہو گئی ادھر ہماری تحریک سکیم سو فیصدی کامیاب ہو رہی تھی۔ ادھر اخبارات میں قیاس آرائیاں ہونے لگیں کہ موجودہ وزارت کا جہاز افتراق کی

چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہونے والا ہے۔ اسمبلی کے دیہاتی رکن رفتہ رفتہ وزیر اعظم کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ جس سے وزیر اعظم کی پوزیشن دن بدن خراب ہو رہی ہے۔ میں نے اپنی دیہاتی تنظیم کے لئے اخبارات میں پروپیگنڈا نہیں کیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اس کے متعلق کسی اخبار میں کوئی خبر شائع نہ ہو۔ تاکہ وزارت کی بے خبری میں ہماری تحریک کامیاب ہو جائے۔ یہاں تک کہ وزارت اس کی مخالفت بھی کرے تو اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ چنانچہ کوئی اخبار صحیح اندازہ نہ کر سکا کہ اسمبلی کے دیہاتی ممبر کیوں وزیر اعظم سے برگشتہ خاطر ہو رہے ہیں۔

آخر ایک دن خبر آئی کہ وزیر اعظم نے اسمبلی کے تمام دیہاتی ممبروں کو اپنی کوٹھی میں چائے پر بلایا ہے۔ تاکہ وہ ان کی شکایات سن سکے یہ اجتماع ہماری کانفرنس سے صرف دو دن پہلے ہونا قرار پایا تھا۔ میں انتہائی دلچسپی سے اس صورت حال کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میں اور صرف میں جانتا تھا کہ دیہاتی آبادی بیدار ہو چکی ہے۔ اب وزیر اعظم کی کوئی تدبیر ان کے لئے خواب آور ثابت نہیں ہو سکتی۔ وہی ہوا۔ دیہاتی ممبروں نے وزیر اعظم کے روبرو کھڑے ہو کر صاف کہہ دیا کہ ان کے ووٹر موجودہ وزارت کو پسند نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اگر ہم نے اسمبلی میں موجودہ وزارت کا ساتھ دیا۔ تو اسمبلی کے آئندہ انتخاب میں جو چھ مہینے تک ہونے والا ہے۔ وہ ہمیں ایک ووٹ نہیں دیں گے۔ وزیر اعظم سخت پریشان ہوا۔ معاملہ کی تہ تک پہنچنے پر اسے معلوم ہوا کہ دیہات

کی رائے عامہ اسمبلی کے ممبروں یا وزارت کے زیر اثر نہیں بلکہ انجمن کے زیر اثر ہے۔ وزیر اعظم دیہاتی ممبروں کو نہ منا سکا اور وہ اپنے اپنے گھروں کو واپس روانہ ہو گئے۔

دوسرے دن یعنی کانفرنس سے ایک دن پہلے میں ادشا کے مطالعہ کے کمرہ میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ کہ ایک نوکر رائے بہادر کے ہاں سے کوئی کتاب لینے کے لئے آیا۔ ادشا کے سب نوکر مجھے جانتے تھے اور کبھی کبھار مجھ سے باتیں بھی کر لیتے تھے۔ اس نوکر نے مجھے مطالعہ کے کمرہ میں دیکھا تو کہنے لگا۔

"بابوجی! آج لاٹ صاحب نے رائے بہادر کو ملاقات کے لئے بلایا تھا۔ سنا ہے لاٹ صاحب رائے بہادر سے دو گھنٹے باتیں کرتے رہے اب رائے بہادر نائٹ بننے والے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"تمہیں یہ کس نے بتایا ہے؟"

نوکر بولا۔

"موٹر ڈرائیور نے۔ بابوجی! موٹر ڈرائیوروں کو سب پتہ ہوتا ہے یہ رائے بہادر کو موٹر میں جہاں لے جائیں۔ وہاں کے نوکروں سے پوچھ کر بہت سی باتوں کا پتہ لگا لیتے ہیں۔"

نوکر کے ان الفاظ نے مجھے گہری سوچ میں ڈال دیا۔ کل وزیر اعظم نے دیہاتی ممبروں سے گفتگو کی اور انہیں منانے میں ناکام رہا۔ آج گورنر

نے رائے بہادر کو ملاقات کے لئے بلا لیا۔ کیا اس کا یہ مقصد تو نہیں کہ رائے بہادر سے ہماری تحریک کی مخالفت کرائی جائے۔ گورنر یہ پسند نہیں کریگا۔ کہ موجودہ وزارت خطرہ میں پڑے۔ لیکن اگر گورنر نے رائے بہادر کو اسی مقصد کے لئے بلایا تھا تو ایک بات ظاہر ہے اور وہ یہ کہ وزیر اعظم بے بس ہو چکا ہے۔ اس کی اپنی طاقت ختم ہو چکی ہے۔ وہ خود کچھ نہیں کرسکتا۔ گورنر سے مدد کی درخواست کرنا اس کے عجز کی دلیل ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ رائے بہادر اگر گورنر کے حکم کی تعمیل کرنا چاہیں تو وہ کیا کرسکتے ہیں۔ اوشا ایک نہایت مخلص اور دیانتدار قومی کارکن ہے۔ مانا کہ رائے بہادر اس کے باپ ہیں لیکن نوجوان تحریک خود اوشا کی پیدا کردہ ہے۔ رائے بہادر اور اوشا کے ملکی خیالات میں مدت سے اختلاف ہے۔ لیکن کیا اب رائے بہادر کے کہہ دینے سے اوشا اپنے کئے کرائے پر پانی پھیر لے گی نہیں اور ہرگز نہیں وزیر اعظم کا یہ تیر بھی نشانہ پر نہیں بیٹھے گا۔

دوسرے دن اتوار تھا اور صبح نو بجے کانفرنس کا اجلاس شروع ہونا تھا۔ دیہات سے نمائندے ہزاروں کی تعداد میں آئے ہوئے تھے رانی باغ میں ان کے لئے ہم نے رہائش اور خوراک کا بندوبست کردیا تھا۔ نیشنل ہال میں اپنی دوسری تقریر کے بعد اوشا نے قومی فنڈ کے لئے اپیل کی تھی۔ اس پر چند ہی دن میں ہزار ہا روپیہ اکٹھا ہوگیا تھا اس لئے کانفرنس کی تیاری میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ اوشا نے آج خاص طور

پر مجھ سے کہا کہ میں رات کا کھانا اسی کے ساتھ کھاؤں ۔ اور میرا ارادہ بھی یہی تھا کہ آج رات اپنے کوارٹر میں نہ جاؤں ۔ تاکہ دیر تک بہت سے معاملات کی دیکھ بھال خود ہی کر سکوں ۔ پتہ نہیں کیوں ۔ یہ معلوم ہونے پر کہ راجے بہادر نے گورنر سے ملاقات کی ہے ۔ دل میں بار بار آتا کہ اوشا کے ہاں سے جلد چلا جاؤں ۔ میں اپنے دل کی اس آواز کو زیادہ دیر تک نظر انداز نہ کر سکا ۔ اور اوشا کے اطلاع دیئے بغیر اس کے کمرہ سے نکل آیا ۔ رانی باغ میں انتظامات وغیرہ ۔ دیکھے ۔ سب کارکن بڑے شوق سے مصروف کار تھے ۔ وہاں سے اپنے کوارٹر میں آیا ۔ کھانا کھایا اور سو گیا ۔

صبح میں بہت جلد اٹھ بیٹھا ۔ نہا دھو کر پانچ بجے ہی تیار ہو گیا ۔ میں آئینہ کے سامنے کھڑا ٹائی درست کر رہا تھا ۔ کہ کسی نے باہر سے دروازہ کھٹکھٹایا ۔ نوکر نے دروازہ کھولا اور آکر مجھے بتایا کہ اوشا کی موٹر مجھے لینے آئی ہے ۔ ڈرائیور نے کہا ہے ۔ اوشا نے مجھے تاکید کی ہے کہ فوراً پہنچے ۔ مجھے معلوم تھا کہ اوشا آٹھ بجے سے پہلے اٹھنے کی عادی نہیں ۔ لیکن کانفرنس کی وجہ سے وہ آج شاید مجھ سے پہلے ہی بیدار ہو ئی ۔ بہر حال عمر میں میرے لئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں کسی موٹر کار میں سوار ہوا ۔ میں اس کی سیٹ کا مقابلہ دفتر کی کرسی سے کرنے لگا ۔

میں اوشا سے ملا ۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی تھی ۔ مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے مطالعہ کے کمرہ میں لے گئی اور بولی ۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"فرمائیے۔ میں حاضر ہوں" میں نے کہا۔

اوشا۔ "میں آج کے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کرنا چاہتی ہوں اور یہ تبدیلی مجھے یونہی نہیں سوجھی۔ میں اس پر رات بھر غور کرتی رہی ہوں۔"

میں: "پروگرام خود آپ کا بنایا ہوا ہے۔ آپ کو اس میں تبدیلی کرنے کا حق ہے۔ مجھے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ البتہ اتنا خیال کر لیجئے کہ کوئی بنیادی تبدیلی نہ ہو۔ آپ جانتی ہیں۔ کہ ہمارا پروگرام بالکل واضح اور حاضرین کی خواہشات آئینہ کی طرح صاف ہیں۔ اگر کوئی ایسی بات پیش کی گئی جو خود ہمارے اصول کے خلاف ہو تو وہ ہماری تحریک کے لئے خودکشی کا باعث ہوگی۔"

اوشا کا چہرہ زرد ہو گیا۔

اوشا: "بشیر! ہم دونوں کی رائے میں اگر اختلاف بھی ہو جائے تو ہمیں اسے برداشت کرنا چاہیئے۔ میرا اور آپ کا ساتھ صرف اس تحریک تک ہی نہیں۔ میں نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف سول میرج کے حق میں انجمن سے پروپیگنڈا کرایا۔ آپ کو معلوم ہے کہ کیوں؟"

یہ کہہ کر اوشا جھینپ گئی۔ اس نے کچھ اور کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے بے تکلف ہو کر مجھے بشیر کہا۔

میں: "اوشا! مجھے ذہین ہونے کا دعویٰ نہیں۔ لیکن میں کچھ زیادہ

کند ذہن بھی نہیں۔ کیا میں نہیں سمجھتا کہ آپ نے سول میرج کی تحریک کیوں کی۔ بشیر اس سے بے خبر نہیں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتیں کہ بشیر کو کس سے کتنی محبت ہے۔ میں اس کا اظہار کرنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ آپ سمجھتی ہیں کہ میرا دل پتھر کا ٹکڑا ہے؟"

ادشا نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شوق اور التجا بیک وقت موجود تھی۔ پھر بولی۔

"میں چاہتی ہوں کہ وزارت کے خلاف جو قرارداد پیش ہونے والی ہے۔ وہ پروگرام میں سے حذف کر دی جائے۔ کیونکہ نوجوانوں کا ایک گروہ اس کے خلاف ہے۔ موجودہ وزارت کی معیاد صرف چھ مہینے باقی ہے۔ اسمبلی کے انتخابات کے وقت ہم سوچ سکتے ہیں۔ کہ اس کے خلاف کیا کرنا چاہیئے۔ سرِدست وزارت پر اعتماد کی قرارداد منظور کر دی جائے۔"

میں۔" ادشا! یہ تم کہہ رہی ہو۔ صوبہ کے تمام دیہات وزارت کی بدانتظامی سے نالاں ہیں۔ وہ فریاد لے کر تمہارے پاس آئے ہیں انہیں شہری زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ نہ انہیں یہاں کے کسی مشغلہ سے تعلق۔ وہ اپنی شکایات لے کر آئے ہیں۔ اور ان کا متفقہ مطالبہ یہ ہے کہ موجودہ وزارت سے پوچھا جائے۔ کہ وہ زمینداروں سے لگان کی صورت میں روپیہ وصول کرنے کے باوجود کیوں اُن سے حیوانوں کا سا سلوک کر رہی ہے۔ وزارت کے خلاف تم نے جو قرارداد

مرتب کی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا مقصد وزارت سے اس روپے کا حساب پوچھنا تھا۔ جو وہ صوبہ سے وصول کرتی ہے۔ کیا چند گھنٹوں کے اندر اندر وہ جرم نیکی سے بدل گیا ہے؟ آخر کس وجہ کی بناپر ہم اس کے حق میں اعتماد کا ووٹ پاس کریں۔ کیا زمینداروں سے کہہ دیں کہ وہ سب بیوقوف ہیں۔ ان کی شکایات غلط ہیں۔ جو سلوک ان سے ہو رہا ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ہے اور وہ ہمارے ساتھ شریک ہو کر دعا کریں کہ وزیر اعظم کی عمر دراز ہو اور وہ اپنی موجودہ پالیسی پر کاربند رہے۔ تم ہی کہو! زمینداروں کو کیونکر مطمئن کیا جائے؟ ہماری انجمن کا مقصد کیا ہے؟ تم نے اتنی زحمت اٹھا کر قوم کی جو تنظیم کی ہے اس کا مقصد وزارت پر اعتماد ظاہر کرنا تھا۔ اور بس!

اوشا ؟ ہم ایک وفد مرتب کر سکتے ہیں۔ وہ وفد مل کر وزیر اعظم سے اپنی شکایات پیش کرے۔ کوئی وجہ نہیں کہ وزیر اعظم ان شکایات پر غور نہ کرے ؟

میں ؟ اوشا! یہ خیالات ایک نوجوان کے خیالات نہیں۔ یہ بوڑھے لوگوں کے خیالات ہیں۔ تم سمجھتی ہو کہ وزیر اعظم جو کچھ کر رہا ہے۔ اسے اس کا کوئی علم نہیں۔ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ اسے زمینداروں سے کوئی ہمدردی نہیں۔ وہ کسی کے لئے کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ اس کا اصول یہ ہے کہ سیکرٹری کے کام میں دخل نہ دیا جائے۔ وہ میری اور آپ کی خاطر اپنا اصول نہیں بدل دے گا۔ میں وفد کی تجویز

کے سخت خلاف ہوں۔ میں وزیرِ اعظم کا نام بھی سننا نہیں چاہتا۔ اس کے دروازے پر جانا میں اپنی قومی توہین سمجھتا ہوں۔

ادشا: مجھے اصرار ہے کہ وفد مرتب کیا جائے اور وزیرِ اعظم سے بالمشافہ گفتگو کی جائے۔

میں: پہلے وزارت کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر لیا جائے۔ اس کے بعد وزیرِ اعظم سے ملاقات کر کے اس کی وجہ بیان کر دی جائے۔"

"میں اس تجویز کی مخالفت کرتی ہوں۔ تمہیں میرا کہا ماننا پڑیگا۔ ابھی ابھی تم نے کہا تھا۔ کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ مگر تمہاری باتوں سے مجھے دشمنی کی بو آتی ہے۔"

میں: "میرے نزدیک ہر وہ چیز اچھی ہے جس سے انسانی زندگی سنورے اور ہر وہ چیز بُری ہے جس سے انسانی زندگی بگڑے۔ اگر میری محبت سے صوبہ کی زندگی پر خوشگوار اثر پڑے تو وہ میرے اصول کے مطابق لازمی طور پر میرے لئے باعثِ فخر ہے۔ اگر اس سے صوبہ کے دکھوں میں اضافہ ہو تو وہ محبت نہیں بلکہ فریب ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے تو اس محبت کا فائدہ ہماری تحریک کو پہنچنا چاہئے۔ نہ کہ وہ ہمارے کئے کرائے پر بھی پانی پھیر دے۔"

میرے اور ادشا کے درمیان بہت بحث ہوئی۔ نہ وہ مانی نہ میں قائل ہوا۔ اس کے اندازِ گفتگو نے رفتہ رفتہ دھمکیوں کی صورت

اختیار کرلی۔ اور وہ کچھ کشیدہ کشیدہ سی نظر آنے لگی۔ اس نے مجھے صاف کہہ دیا۔ کہ وہ وزارت کے خلاف قرار داد منظور نہ ہونے دیگی۔

کانفرنس کی کاروائی شروع ہوئی۔ سترّ اسّی ہزار کی حاضری تھی۔ پروگرام کی ہر شق بڑی خیر و خوبی سے پوری ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ اور وزارت کے خلاف ووٹ پیش کرنے والی صرف آخری شق باقی رہ گئی۔ ادشا اپنی کرسی سے اٹھی اور حاضرین سے مخاطب ہوئی

" بھائیو! میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ اتنا لمبا سفر طے کر کے یہاں آئے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی آپ اسی طرح ہماری انجمن میں دلچسپی لیتے رہیں گے۔ کسی مصلحت کے ماتحت ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ پروگرام کی آخری شق کو اب نظر انداز کر دیا جائے۔"

میں نے معذرت کی نظروں سے ادشا کی طرف دیکھا۔ اور اس کے پاس ہی کھڑے ہو کر کہا۔

" بھائیو! اصل بات یہ ہے کہ وزارت کے معاملہ میں نوجوانوں کے دو گروہ بن گئے ہیں۔ ایک گروہ وزارت کے حق میں قرار داد پیش کرنا چاہتا ہے۔ اور دوسرا گروہ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ تجویز کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اب اس معاملہ میں بحث کی ضرورت نہیں۔ وہ بھائی کھڑے ہو جائیں۔ جن کو وزارت پر اعتماد ہے۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ وزارت ہی ہماری نمائندہ ہے۔"

میں نے دیکھا۔ کہ ادشا کے چہرہ پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی

اور اس نے قدرے فاتحانہ انداز سے میری طرف دیکھا۔ مگر اس کی مسکراہٹ فوراً ہی غائب ہوگئی کیونکہ پنڈال میں سے ایک فرد بھی کھڑا نہ ہوا تھا۔ اوشا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ میں پھر حاضرین سے مخاطب ہوا۔

"برادران! آپ میں سے جو دوست موجودہ وزارت کے خلاف ہیں اور چاہتے ہیں کہ وزارت مستعفی ہو جائے اور سمجھتے ہیں کہ اس وزارت نے صوبہ کو تباہی کے راستہ پر چلایا ہے۔ وہ کھڑے ہو جائیں۔"

تمام حاضرین اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک بھی شخص بیٹھا نہ رہا۔ اور میں نے اعلان کر دیا کہ وزارت کے خلاف ملامت کا ووٹ متفقہ طور پر پاس ہو گیا۔ میں نے اوشا سے کہا۔

"اوشا! اس موقعہ پر تم بھی بیٹھنا بھول گئیں کم از کم تمہیں تو کھڑے نہیں رہنا چاہیے تھا۔"

اوشا نے غضبناک ہو کر کہا۔

"تم جنگلی درندے ہو۔ تمہیں عورتوں کے احساسات کی ذرا پروا نہیں۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ تمہیں اپنی اصلیت کو نہیں بھولنا چاہیے تھا۔ میری اور تمہاری پوزیشن میں کتنا فرق ہے؟ میرے عزیز مجھے کہتے رہے۔ تم ایک گھٹیا درجہ کے آدمی کو منہ لگا رہی ہو۔ مگر میں نے ان کی پرواہ نہ کی۔ اور تمہیں اپنے برابر جگہ دی۔ تم یقیناً اس قابل نہیں تھے کہ میں تمہیں منہ لگاتی۔ میں سمجھتی تھی۔ تم

ہماری عزّت کو اپنی عزت سمجھو گے۔ مگر تم وحشی ثابت ہوئے۔ آج تم نے ہماری خاندانی عزت مٹی میں ملا دی۔ ہم اس کا بدلہ لئے بغیر نہیں رہیں گے۔ یاد رکھو ہم تمہارے ایسے سو وحشی آدمیوں کا خون بہا دیں۔ تو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ تمہیں ہماری طاقت اور رسوخ کو سمجھنے میں سخت دھوکا ہوا ہے۔"

اوشا اس وقت راجے بہادر کی صاحبزادی تھی اور بس۔ اوشا کے اس سلوک سے پنڈال کی وسیع فضا مجھے تنگ ہوتی محسوس ہوئی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ جسم اس طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے میری رگوں میں کوٹ کوٹ کر برف بھر دی ہو۔ پاؤں سو سو من کے ہو رہے تھے۔ میں اپنے آپ کو زمین کے سینے پر ایک سب سے زیادہ بوجھل شئے سمجھنے لگا۔ اوشا سے بہت کچھ کہنا چاہا۔ مگر زبان نے ساتھ نہ دیا۔ دل بیٹھ جائے تو آواز بھی نہیں نکلتی۔ گلے نے بڑی کوشش کے بعد چند الفاظ زبان کی طرف دھکیلے۔ لیکن ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اوشا پر صرف ایک نگاہ ڈالی۔ اور اس نگاہ سے جو کچھ کہا جا سکا۔ اس نے کہہ دیا۔ میں سٹیج سے نیچے اترا۔ بیشمار نگران۔ ناظم۔ عامل میری راہ دیکھ رہے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ معانقہ کیا بعض نے میرے ہاتھ بھی چومے۔ مگر میں غیر حاضر تھا۔ انہوں نے کیا کہا۔ مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ جو شخص میرے قریب آیا۔ ہاتھ ملاتا گیا۔ یونہی ہاتھ آگے کئے میں نے چلنا شروع

گیا۔ اور تھوڑی دیر میں پنڈال سے باہر تھا۔

کتا جب کسی نئے گاؤں میں سے گزرتا ہے۔ تو اس گاؤں کے سارے کتے اس پر پل پڑتے ہیں۔ اور اس کی تکا بوٹی کرنے سے نہیں چوکتے۔ اس لئے کتا اپنے لئے ایسا راستہ چنتا ہے۔ جو انسانی آبادی سے دور دور ہی گزر جائے۔ تاکہ وہ اپنے ہمجنسوں کے ہاتھوں اپنی ہڈی پسلی سلامت لے جائے۔ اشرف کی غداری سے میں بہت بُری طرح پٹا تھا۔ اب اوشا کے سلوک نے ہڈی پسلی ایک کر دی۔ پنڈال سے نکل کر میں نے اپنے ہمجنسوں کے ہاتھوں پٹے ہوئے کتے کی طرح ایسا راستہ اختیار کیا جس پر اپنے ہمجنسوں سے دو چار ہونے کا کم امکان تھا۔ آج کے واقعہ نے دماغ پر اتنا بوجھ ڈال دیا۔ کہ اشرف کی یاد تک فراموش ہو گئی۔ حق یہ ہے کہ میرے دل کے نزدیک اوشا کے دیئے ہوئے عذاب کے سامنے اشرف کی غداری ایسی ہی تھی۔ جیسے پہاڑ کے مقابل رائی کا دانہ رکھ دیا جائے مجھے اپنے ہمجنسوں سے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ میں راہگیروں سے کتراتا اور نظر بچاتا ایک گھنٹہ میں اپنے کوارٹر تک پہنچا۔ یہ وہی فاصلہ تھا۔ جسے میں اوشا سے ملنے کے لئے جاتے وقت بیس پچیس منٹ میں طے کر لیتا تھا۔

دوسرے دن دفتر میں میری حاضری تھی۔ یہ سوموار کا روز تھا۔ اور میں ڈیڑھ مہینہ کے بعد اپنی ڈیوٹی پر واپس آرہا تھا۔ صبح دفتر

میں حاضر ہوا۔ وہی کمرہ۔ وہی میز کرسی۔ وہی سامنے ایک بڑی الماری اور اس میں چند فائل۔ کچھ سٹیشنری کی چیزیں اور دو تین کتابیں اسسٹنٹ لیڈی ڈاکٹر ہسپتال کی انچارج تھی اور اکیلی کام کرتی تھی۔ نرس بھی موجود تھی۔ ہر چیز ویسی کی ویسی تھی۔ جیسے میں ڈیڑھ مہینہ پہلے چھوڑ گیا تھا۔ صرف ڈاکٹر ثریا موجود نہ تھی۔ کچھ گذشتہ دو حادثوں کا اثر اور کچھ ڈاکٹر ثریا کی عدم موجودگی کا احساس۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ہسپتال ایک مردہ لاش ہے جیسے روح مردود قرار دے کر پرواز کر گئی ہو۔ اپنی توجہ کو فائلوں کے صفحوں پر مرتکز کرنا چاہا کامیابی نہ ہوئی۔ ایک بے چینی اور بے کلی تھی کہ کسی پہلو قرار نہ تھا ہسپتال میں دوسری ڈاک ٹھیک بارہ بجے آتی تھی۔ اور یہی وقت ہیڈ آفس سے چپڑاسی کے مقامی ڈاک لانے کا تھا چٹھی رساں میرے نام کا ایک لفافہ لایا۔ جسے کھول کر پڑھا۔ تحریر تھا۔

کوہ اماوس

۴ ارجون

میرے دوست بشیر!

میری پیاری بیوی ڈاکٹر ثریا نے تمہارا خط ابھی ابھی مجھے دکھایا۔ اسی وقت جواب لکھ رہا ہوں۔ میں گذشتہ چند سال اندھا دھند تمہیں روپیہ دیتا رہا اور تم خرچ کرتے رہے۔ کتنے ہزار روپیہ تم نے مجھ سے لیا۔ اس کا حساب تمہیں یاد ہونا چاہیے۔ ثریا اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہے

کہ تمہاری جیبیں ہیرے نوٹوں سے بھری رہتی ہیں۔ میری ذمہ داریاں اب بڑھ گئی ہیں۔ میں تمہاری دوستی کی قیمت اب ادا نہیں کر سکتا۔ اور نہ مجھے تمہاری زیارت کا شوق ہے۔ بہتر ہے کہ اس قسم کے بیہودہ خطوط لکھ کر تم مجھے پریشان نہ کرو۔ میرا آخری سلام قبول کرو۔ اور امن سے مجھے زندگی بسر کرنے دو۔ کرافرڈ موٹر کمپنی کے حصّے خریدنے کے لئے میں نے تمہیں کبھی نہیں کہا۔ اور نہ ایک کلرک کی حیثیت یہ ہو سکتی ہے۔ کہ وہ اتنا بلند پرواز کرے۔ اور کرافرڈ جیسی کمپنی کے حصّے خریدنے کی خواہش رکھے۔ تم بیوقوف ہو۔ بلکہ بے وقوفوں کے وزیر اعظم۔ وزیر اعظم صاحب آداب عرض!

میں یہ خط ثریا کو دکھا کر ڈاک میں ڈال رہا ہوں۔

اشرف

لفافہ کو پلٹ کر دیکھا۔ اس پر مہر ریاض آباد کے ڈاکخانہ کی تھی اشرف کے متعلق اس کے والد نے جو کچھ کہا تھا اس کی تصدیق ہو گئی۔ میرا پانچ ہزار روپیہ ملنے کی آخری امید بھی جاتی رہی۔ ثابت ہوا کہ اشرف ثریا کو بھی برابر دھوکا دیئے جا رہا ہے۔ اور میرے معاملہ میں وہ بھی اشرف کی ہم خیال ہے۔ قہر درویش بر جان درویش خط پڑھ کر جیب میں ڈالا اور خاموش ہو رہا۔

ابھی دس منٹ نہ گزرے تھے کہ مجھے لیڈی ڈاکٹر نے بلایا۔ میرا دل پاش پاش ہو رہا تھا۔ میری تمام توجہ گزشتہ واقعات پر تھی۔ اور میں یہ سوچ رہا تھا۔ کہ جو کچھ مجھ پر گزر رہی ہے۔ یہ حقیقت ہے یا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ اگر یہ حقیقت نہیں تو یقیناً یہ ایک نہایت بھیانک خواب ہے جس کا اثر میرے بیدار ہونے پر بھی دل و دماغ پر مستول رہے گا۔ اور اگر یہ حقیقت ہے تو میری تباہی کے لئے یہ دو واقعات کافی ہیں۔

"بشیر! مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم جانتے ہو۔ یہ سرکاری محکمہ ہے۔ اس میں بڑی احتیاط سے کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ لو اور اس کا جواب لکھ دو!"

لیڈی ڈاکٹر نے ایک کاغذ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے پڑھا۔ لکھا تھا۔

بشیر کلرک وجہ بیان کرے کہ مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر کیوں نہ اسے ملازمت سے جواب دیا جائے۔

۱۔ اس کا کام تسلی بخش نہیں۔ جب وہ ڈیڑھ ماہ کی رخصت پر تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے ہسپتال کے دفتر کا معائنہ کیا۔ جس میں ثابت ہوا کہ فائل درست حالت میں نہ تھے۔ خط و کتابت نامکمل تھی۔ اور بعض سرکاری چٹھیوں کا پتہ نہ لگ سکا کہ وہ کہاں تھیں۔

۲۔ اس نے سرکاری ملازم ہوتے ہوئے نوجوانوں کی ملکی تحریک میں حصّہ لیا۔ جو قواعد کے سراسر خلاف ہے۔ اس کا یہ فعل ایک سنگین جرم ہے۔

۳۔ ڈاکٹر ثریا کی رائے ہے کہ بشیر دفتر کا کام نہیں چلا سکتا اس کے رخصت سے واپس آنے تک کوئی اور کلرک ہسپتال میں مقرر کیا جائے۔

بشیر کو چاہیئے کہ وہ ان الزامات کا جواب پوری تفصیل کے ساتھ دے۔ محکمہ کوئی آخری فیصلہ کرنے سے پہلے اس کے جواب پر پورا غور کریگا۔

سپرنٹنڈنٹ

میں نے لیڈی ڈاکٹر سے پوچھا۔ کیا واقعی میری غیر حاضری میں سپرنٹنڈنٹ نے اس دفتر کا معائنہ کیا تھا؟ اس پر لیڈی ڈاکٹر بالکل خاموش رہی۔ اس نے میرے سوال دہرانے پر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ مطلب صاف تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اس ٹوہ میں تھا کہ میرا کوئی کمزور پہلو دکھائی دے۔ تو وہ اس پہلو سے مجھ پر حملہ کرے۔ جب تک ڈاکٹر ثریا مہربان تھی سپرنٹنڈنٹ کو جرأت نہ ہوئی۔ کہ وہ میرے خلاف کوئی کاروائی کر سکے۔ اب اُسے معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ ڈاکٹر ثریا میرے خلاف ہے یا کم از کم میری حمایت نہ کرے گی تو اس نے یہ شاخسانہ کھڑا کر دیا۔ ڈاکٹر ثریا کو میں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ میں نے اس کے کسی حکم

کی خلاف ورزی نہ کی تھی۔ وہ ہمیشہ میرے کام کی تعریف کیا کرتی تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اب اس کی رائے میرے خلاف ہو گئی۔ سپرنٹنڈنٹ لاکھ میرے خلاف سہی۔ وہ سرکاری طور پر مجھے کبھی نہیں لکھ سکتا تھا کہ ڈاکٹر ثریا کی رائے میرے خلاف ہے۔ جب تک کہ ڈاکٹر ثریا نے دراصل میرے خلاف تحریری رپورٹ نہ کی ہو۔ سوال یہ ہے ڈاکٹر ثریا نے میری مخالفت کیوں شروع کر دی۔ وہ ایک افسر ہے۔ میں کلرک ہوں۔ اس کا بلا وجہ میری مخالفت کرنا عجیب سی بات ہے کیا وہ مجھے بھوکا مارنا چاہتی ہے۔ میری روزی چھین لینے سے اُسے کیا ہاتھ آئے گا۔ باپ دادا کی جائداد بیچ کر رقم اس کے خاوند کو دے دی۔ ملازمت ہی آخری ذریعۂ معاش ہے۔ یہ بھی چھن گئی تو کہاں جاؤں گا۔

ان تمام خیالات کے ہوتے ہوئے بھی میں اپنے آپ کو الزامات کا لمبا چوڑا جواب لکھنے پر اور معافی مانگنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ میں نے قلم اٹھایا اور اسی کاغذ پر لیڈی ڈاکٹر کے سامنے ہی لکھ دیا۔

"یہ الزامات صحیح ہیں۔ میرے پاس ان کا کوئی جواب نہیں۔"

لیڈی ڈاکٹر نے میرے یہ الفاظ پڑھ کر عینک کے اوپر سے مجھے گھور کر دیکھا اور قدرے خفگی سے کہا۔

"مسٹر! تم جانتے ہو تمہارے اس جواب کا کیا نتیجہ ہوگا؟ تم ملازمت سے علیحدہ کر دیئے جاؤ گے۔ ہوش کی دوا کرو۔ آج کل زمانہ بڑا خراب ہے دیا؟

نوکری نہیں ملے گی۔"

میں نے عرض کیا۔

"بات یہ ہے کہ میرے پاس ان الزامات کا کوئی جواب نہیں مجھے اپنا انجام صاف نظر آتا ہے۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔"

لیڈی ڈاکٹر نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ جواب لکھ کر تم خودکشی کر رہے ہو۔"

میں خاموش ہو رہا۔ کاغذ اسی دن واپس ہیڈ آفس بھیج دیا گیا۔ دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ کا حکم آ گیا۔

"بشیر کا کیس سیکرٹری کو بھیج دیا گیا ہے۔ جب تک اس کا قطعی فیصلہ نہ ہو جائے۔ آج کی تاریخ سے اُسے معطّل کیا جاتا ہے۔ قواعد کے مطابق اُسے آخری فیصلہ سے پہلے شہر سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔ دفتر میں کام کرنے کے لئے کل سے نیا کلرک بھیج دیا جائے گا۔"

یوں بھی دفتر بند کرنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس حکم پر لیڈی ڈاکٹر نے میرے دستخط کرا لئے۔ کہ میں نے وہ پڑھ لیا ہے۔ اور میں اپنے کوارٹر میں آ گیا۔

اشرف نے مجھ سے غدّاری کی۔ میرا پانچ ہزار روپیہ لٹ گیا۔ اوشا ہمیشہ کے لئے ناراض ہو گئی۔ نوجوان تحریک کا پنپنا بیحد مشکوک ہو کر رہ

گیا۔ ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ان تمام حادثات نے دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔ اور کچھ عرصہ یوں معلوم ہونے لگا۔ کہ اب میں کوئی بات سوچ نہیں سکتا۔ سوچنے کی طاقت سلب ہو گئی ہے۔ جو شاید پھر عود کر نہ آسکے۔ جسم اکڑا اکڑا سا محسوس ہوا۔ رگ و پے میں تھکاوٹ ہی تھکاوٹ تھی۔ کوارٹر میں جا کر لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ اٹھا تو شام کے چھ بج چکے تھے۔ اب دماغی حالت قدرے بہتر تھی۔ میں نے تمام حادثات کی تفصیل پر غور کیا۔ پھر اپنے دل کو ٹٹولا۔ اپنی سمجھ کے مطابق یہ پتہ کرنے کی کوشش کی کہ میں خود ان حادثات کا کہاں تک ذمہ دار ہوں۔ بڑی سختی سے احتساب کیا۔ ہر دفعہ یہی ثابت ہوا۔ کہ میری بُری نیت یا کسی منصوبہ کو ان حادثات سے تعلق نہیں۔ دل مجروح تھا۔ لیکن ضمیر مجروح نہیں تھا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ دل کو تسلی دی اور کہا کہ ہو سکتا ہے قدرت میرے ظرف کو ناپ رہی ہو۔ دنیا میں ہر قسم کی قابلیت کے امتحان مقرر ہیں۔ میں نے صوبہ کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے۔ کیا اتنا بڑا بوجھ اٹھانے والے میں قدرت کا قابلیت تلاش کرنا ممکن نہیں؟ ہو سکتا ہے کہ وہ میری آزمائش کر رہی ہو۔ مجھے صبر و شکیب سے کام لینا چاہیئے۔ اگر میں صبر نہ کروں۔ تو کسی کا کیا بگاڑ لوں گا۔ میری حیثیت ہی کیا ہے کہ کسی کے منہ آسکوں۔

میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

یکایک دل میں خیال آیا کہ خان بہادر شمشیر علی سے کیوں نہ ملا جائے وہ بیرسٹر ہیں ممکن ہے کوئی مفید قانونی مشورہ دے سکیں۔ اسوقت مجھے سب سے زیادہ ضرورت کسی غمخوار کی ہے۔ ایسے غمخوار کی ضرورت ہے جس کے سامنے اپنی داستان بیان کرکے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرسکوں۔ اس قسم کی رازداری کے لئے ایک خبردار بوڑھے سے بڑھ کر کون زیادہ موزوں ہوسکتا ہے۔ پھر سوچا۔ مدتیں گزر گئیں۔ میں خان بہادر کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔ اڑھائی تین مہینے ہسپتال میں بھی ملازمت کی۔ اور ان کے مکان کے نزدیک رہا۔ لیکن بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کیا۔ پتہ نہیں وہ مجھ سے کس طرح پیش آئیں۔ دنیا چڑھتے سورج کو پوجتی ہے۔ ڈوبتے سورج کا نظارہ صرف شاعروں کے لئے ہے جنہیں عملی زندگی سے تعلق نہیں ہوتا۔

بہت کچھ ردّ و بدل کے بعد میں خان بہادر کے ہاں پہنچ ہی گیا۔ اپنا ملاقاتی کارڈ —————— وہ کارڈ جو محض ادشا کی خاطر چھپوایا تھا۔ اندر بھیجا۔ خان بہادر نے اسی وقت بلا لیا۔ کسی خون کے مقدمہ کی تیاری کر رہے تھے۔ چاروں طرف کتابوں کے انبار لگے

ہوئے تھے۔ کتابوں کی طرف سے توجہ ہٹا کر بڑے تپاک سے ملے میرے جلدی جلدی نہ ملنے پر بزرگانہ سرزنش کی۔ محبت آمیز شکوہ کیا اور حالات دریافت فرمائے۔ میں پہلے ہی چاہتا تھا۔ کہ کوئی پوچھے۔ تو سب کچھ بتا دوں۔ پھوڑا مواد سے بھرا ہوا تھا۔ نشتر دکھانا تھا کہ وہ سب بہ نکلا۔ میں نے سب کچھ کہہ دیا۔ جو مجھے کہنا چاہیئے تھا وہ بھی کہہ سنایا۔ جو نہیں کہنا چاہیئے تھا وہ بھی اُگل دیا۔ میری سرگزشت سن کر خان بہادر بے حد متاثر ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک دم ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک سی پیدا ہوگئی۔ اور انہوں نے دفعتاً اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا۔ فکر نہ کرو۔ میں دیکھوں گا۔ اس وقت میں ایک بڑے اہم مقدمہ کے لئے بعض حوالے تلاش کر رہا ہوں۔ آپ صبح پونے پانچ بجے اسی کمرہ میں میرے پاس آجائیں۔ میں دیکھوں گا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ میں رات کو نو ساڑھے نو بجے سو جاتا ہوں۔ چار بجے صبح اٹھنے کا عادی ہوں۔ میں اپنے مقدمات کی تیاری صبح کرتا ہوں شام کو بعض حوالہ جات دیکھ لیتا ہوں اور بس! آپ ٹھیک پونے پانچ بجے آجائیں۔ پھر دیکھیں گے کیا کرنا چاہیئے۔ آپ کے معاملہ سے فارغ ہو کر مجھے ایک نہایت ضروری مقدمہ کی تیاری کرنی ہے جس کی پیشی کل ہی ہے۔"

مجھے پتہ تھا کہ میں صبح اتنی جلدی اٹھنے کا عادی نہیں۔ خان بہادر

تھے کہ ٹھیک پانچ بجے طلب فرما رہے تھے۔ بہرحال میں نے وعدہ کر لیا کہ وقت مقررہ پر پہنچ جاؤں گا۔ میں رخصت ہونے لگا۔ تو خان بہادر نے مجھے پھر تسلی دی۔ اور کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ انسان پر تکلیفیں بھی آہی جاتی ہیں۔

میں نے کوارٹر میں آ کر نوکر کو ہدایت کی کہ وہ مجھے تین ساڑھے تین بجے صبح ضرور جگا دے۔ اس نے ناشتہ کے متعلق دریافت کیا کہ کب تیار کروں۔ میں نے کہہ دیا کہ حسب معمول سات بجے کے قریب آنکھ کھلی تو ساڑھے چار بج چکے تھے۔ نوکر ابھی تک پڑا سو رہا تھا۔ اسے خود ہوش نہ تھا۔ وہ مجھے کیا بیدار کرتا۔ بات دراصل یہ تھی۔ کہ یہ جون کا پہلا ہفتہ تھا۔ اور گذشتہ روز شدت کی لو چلی تھی۔ دوپہر رات تک بلا کی گرمی رہی۔ اور کروٹیں بدلتے ہی بن پڑی۔ کہیں تیسرے پہر جا کر آنکھ لگی۔ بھلا تین بجے کیسے جاگ آ جاتی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ساڑھے چار بجے آنکھ کھل گئی۔ کچھ عجب نہ تھا کہ چھ بجے ہی ہوش آتا۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا۔ کپڑے پہنے اور چلنے لگا۔ خان بہادر کا مکان صرف پانچ سات منٹ کے فاصلے پر تھا۔ اس لئے دیر ہو جانے کے باوجود کچھ زیادہ گھبراہٹ نہ تھی۔ گلا خشک ہو رہا تھا۔ پیاس محسوس ہوئی۔ میں نے صراحی سے گلاس میں پانی انڈیلا۔ اس میں صرف ایک ہی گلاس پانی تھا۔ معلوم ہوا کہ رات نوکر اس میں پانی بھرنا بھول گیا تھا۔ صراحی پر گلاس اوندھا دھرا تھا۔ اس لئے پانی

کو روشنی میں دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اور جلدی میں پی گیا۔ پانی کچھ بدمزہ سا معلوم ہوا۔ مگر جلدی میں اس کی پروا نہ کی۔ گلاس ختم کرتے ہی دم لیا۔ ہسپتال کے احاطہ سے میں نکلا ہی تھا کہ سر چکرانے لگا۔ اور انتڑیوں میں درد اٹھا۔ خیال آیا کہ واپس چلا جاؤں۔ درد سے اذیت ہو تو پھر خان بہادر کے یہاں جاؤں۔ پھر سوچا کہ آخر درد ہی تو ہے۔ دُور ہو جائے گا۔ خان بہادر بڑے آدمی ہیں۔ ان کا یہ کرم ہے کہ میرے معاملہ پر توجہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ورنہ وہ کوئی ایسا مقدمہ ہی نہیں لیتے جس میں دو تین ہزار سے کم ملنے کی امید ہو۔ میرا وقت کی پابندی نہ کرنا لازمی طور پر انہیں ناراض کر دے گا۔ مجھے بہرحال وہاں پہنچنا چاہئے۔ میں زیادہ تیزی سے چلا۔ درد اور بڑھ گیا۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ میرے کندھوں پر سر نہیں بلکہ میں گرد ہوائی اٹھائے ہوئے ہوں۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتا۔ تو پیٹ بے قابو ہو جاتا۔ پیٹ کو دباتا تو سر ہاتھوں سے نکل کر خود گرنے اور مجھے گرانے کی کوشش کرتا۔ درد بڑھتا گیا۔ اور میں اپنی کانپتی ہوئی ٹانگوں کی رفتار تیز کرتا گیا۔ آخر میں بے بس ہو گیا سر اور پیٹ دونوں کو میں نے چھوڑ دیا۔ مجھے اپنے قریب کوئی دوسرا شخص نظر نہ آتا تھا۔ لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ کوئی میرے سر کو ہتھوڑوں سے پیٹ رہا ہے۔ اور پیٹ میں چھرے پر چھرا گھونپے جا رہا ہے مجھے اتنا ہوش ہے کہ میں سیدھا خان بہادر کے مطالعہ کے کمرے میں

گھسا۔ اس میں روشنی تھی۔ خان بہادر بیٹھے تھے۔ میں ان کے سامنے پہنچا۔ مجھے زور کی قے آئی اور میں منہ کے بل فرش پہ گر پڑا۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔

جب مجھے ہوش ہوا۔ تو میں مردانہ ہسپتال میں چار پائی پر لیٹا تھا میرے ماتھے اور نچلے ہونٹ پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں بے حد کمزور تھا۔ میرے اعضا اکڑے ہوئے تھے۔ اور میں حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک گوشہ میں نرس کاغذ پہ کچھ لکھ رہی تھی۔ اور میرے قریب خان بہادر کا کلرک بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر کلرک کرسی سے اٹھا۔ اور میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔

"بغیرو! تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔ خان بہادر یہاں سے ابھی ابھی گئے ہیں۔ وہ کل صبح تمہیں دیکھنے کے لئے پھر آئیں گے۔ خان بہادر نے یہاں ہم دو کلرکوں کی باری باری ڈیوٹی مقرر کر رکھی ہے۔ میں ابھی آیا ہوں۔ رات تمہارے پاس رہوں گا۔"

میں نے اس سے دریافت کیا۔

"میں کب سے یہاں ہوں۔ مجھے کیا ہو گیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔

"تم دس گیارہ گھنٹوں سے یہاں ہو۔ تم نے زہر کھا لیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم بچ گئے۔"

میں نے زہر کھا لیا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ دماغ ابھی تک ماؤف تھا۔ کوئی خیال ذہن میں نہ آتا تھا۔ میں نے کیوں زہر کھایا؟ کس وقت کھایا؟ ہسپتال میں کیسے پہنچ گیا۔ ان سب باتوں سے ایک بات بھی میری سمجھ میں نہ آئی۔ میری آنکھیں اب بھی پھٹی پھٹی سی تھیں۔ کلرک کی شکل مجھے کانپتی اور ناچتی نظر آ رہی تھی۔ میں نے کلرک سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہیں۔ لیکن لفظوں کو ترتیب دے کر بامعنی فقرے نہ بنا سکا۔ رفتہ رفتہ مجھ پر پھر غنودگی طاری ہوئی اور میں بے ہوش گیا۔

جب میری آنکھ دوبارہ کھلی۔ تو پہلے کی نسبت مجھے آرام تھا۔ میں ہر چیز صاف صاف دیکھ سکتا تھا۔ میں بہت کمزور تھا۔ ہلنے جلنے کی طاقت نہ تھی لیکن اب بول سکتا تھا۔ لیٹے لیٹے اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ صرف اس قدر نظر آیا کہ خان بہادر کا دوسرا کلرک میرے پہلو میں بیٹھا ہے۔ اور باہر سے سورج کی شعاعیں کھڑکی کے راستہ سے اندر آ رہی ہیں۔ مجھے یاد آ گیا۔ دوسرے کلرک نے مجھے بتایا تھا کہ میں نے زہر کھا لیا ہے مزید معلومات حاصل کرنے کی خواہش ہوئی میں نے کلرک کو پکارا میری آواز ایک کراہ کا انداز رکھتی تھی کلرک فوراً میری طرف لپکا میں نے اس کو مدہم آواز میں کہا۔

"مجھے بتاؤ میں نے کیوں زہر کھایا؟ زہر کھانے کے بعد کیا ہوا؟ میں یہاں کیسے آیا؟ خان بہادر کہاں ہیں؟"

نوکر نے اپنے منہ کو میرے کان کے قریب کرتے ہوئے رازدارانہ

انداز سے کہا۔

"آپ زہر کھا کر خان بہادر کے پاس جب آئے تو آپ کو قے ہو گئی۔ اس نے آپ کو بچا دیا۔ خان بہادر نے اسی وقت بڑے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا اور آپ کو موٹر میں ڈال کر یہاں لے آئے۔ یہ ہسپتال کا پرائیویٹ وارڈ ہے۔ خان بہادر اس کا خرچ اپنے جیب سے ادا کر رہے ہیں۔ ان کا اپنا ڈاکٹر بھی یہاں تین چار دفعہ آ کر آپ کو دیکھ چکا ہے۔ لیکن علاج ہسپتال والے ہی کر رہے ہیں۔ پولیس نے آپ کے کوارٹر کی تلاشی لی ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ کی ایک صراحی اور گلاس پر قبضہ کر لیا ہے۔ صراحی میں زہر موجود تھا۔ اور اس کے ادھر ادھر بھی تھوڑا سا زہر گرا ہوا تھا۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ آپ کا نوکر زیر حراست ہے۔ شہر کے بعض دوا فروشوں سے پوچھا جا رہا ہے۔ کہ وہ زہر کس نے فروخت کیا تھا۔ اور کون خریدنے آیا تھا۔ ابھی تک کسی دوا فروش نے یہ نہیں کہا کہ اس کی دکان سے وہ زہر خریدا گیا تھا"

پھر کلرک نے جھجکتے جھجکتے کہا۔

"پولیس کا خیال ہے کہ شاید آپ نے خود زہر کھا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔"

میرے دوبارہ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ خان بہادر اس وقت ہسپتال میں ہی ہیں۔ اور وہ بڑے ڈاکٹر سے میرے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ خان بہادر کا ہلکہ سا قہقہہ مجھے

سنائی دیا۔ ایک ہی منٹ میں ڈاکٹر اور خان بہادر میرے سامنے کھڑے تھے ۔خان بہادر نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا ۔

" انسپکٹر تم بڑے سخت جان ہو۔ تم سے زیادہ بہادر آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اب اٹھ بیٹھو ۔کب تک لیٹے رہو گے"

ڈاکٹر نے میری آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں ۔خان بہادر سے کچھ کہا۔ اور کسی دوسرے مریض کو دیکھنے کے لئے چلا گیا۔ نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ اور خان بہادر سے میں نے کہا۔

"میں کس قدر نالائق ہوں کہ آپ ایسے بزرگ کو بھی اپنی تکلیف کی لپیٹ میں لے لیا۔"

خان بہادر نے بڑے سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔

" میں بوڑھا ہوں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں ۔ اگر اپنے کسی ہونہار نوجوان کی تکلیف میں اس کی مدد کر سکوں تو اس عمر میں اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو سکتی ہے۔"

میرے بہت سے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا

" آپ کے کوارٹر سے پولیس کو ایک صراحی ملی ہے جس کے ارد گرد زہر گرا ہوا تھا معلوم ہوتا ہے۔ رات کو کسی شخص نے آپ کی صراحی میں زہر ڈال دیا ہو۔ اور صبح اٹھ کر آپ نے زہر آب پی لیا۔ میرا قیاس یہ ہے کہ زہر ڈالنے والا ہسپتال ہی میں سے کوئی شخص ہے ۔صراحی کے قریب اونچی ایڑی کی زنانہ گرگابی کے نشان پائے گئے ہیں۔

غالباً سمجھا گیا کہ صراحی پانی سے بھری ہوئی تھی۔ اس لئے بہت سا زہر اس میں ڈالا گیا۔ تاکہ جب وہ سارے پانی میں حل ہو تو اس کا اثر آپ کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہو۔ لیکن صراحی میں پانی صرف ایک دو گلاس تھا۔ اس سے سارے کا سارا زہر پانی کی تھوڑی سی مقدار میں حل ہو گیا۔ یہ زہر اتنا زیادہ تھا کہ معدہ میں نہ ٹھہر سکا۔ اور قے کے ذریعے باہر آگیا یہی وجہ ہے کہ آپ بچ گئے۔

میرے ذہن میں خان بہادر کا یہ فقرہ گونجنے لگا۔

"صراحی کے قریب اونچی ایڑھی کی زنانہ گرگابی کے نشان پائے گئے ہیں۔"

میرا ذہن ثریا کی طرف منتقل ہوا۔ کیا ڈاکٹر ثریا نے میری جان لینے کی ٹھان لی ہے؟ آخر وہ کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہے؟ میں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ یا خدا یہ کیا ماجرا ہے کیا میری مصیبتوں نے اس عورت کا روپ دھار لیا ہے؟ مجھے اس سے کبھی کوئی توقع نہیں ہوئی۔ یہ میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی خان بہادر کیا کچھ کہہ گئے ہیں صحیح طور پر کچھ نہیں بتا سکتا۔ جب ثریا کے خیال نے مجھے چھوڑا۔ تو خان بہادر کہہ رہے تھے۔

"میں نے پولیس کو بتا دیا ہے۔ کہ اگر نثیر کا ارادہ زہر کھا کر خودکشی کرنے کا ہوتا تو وہ زہر کو صراحی میں کیوں ڈالتا۔ وہ اسے گلاس میں حل کرکے پی لیتا۔ میرا یہ نکتہ ناقابل تردید ہے۔ لیکن آپ کا نوکر پولیس

کی حراست میں ہے۔ اس نے بیان دیا ہے کہ چند روز سے آپ بحد متفکر نظر آتے تھے۔ کئی دفعہ جاگتے ہی جاگتے رات گذار دیتے تھے اور اس نے کئی بار آپ کو خود اپنے آپ سے پاگلوں کی طرح باتیں کرتے سنا۔ وہ یہ نہیں بتا سکا۔ کہ آپ کیا باتیں کرتے رہے ہیں۔ لیکن پولیس اس سے یہ نتیجہ نکالتی ہے کہ کئی دن کسی خاص بات کا فیصلہ کرنے کے لئے آپ پریشان رہے۔ اور وہ بات خودکشی ہی تھی۔

اب اگر ان کو یہ بتایا جائے کہ آپ کی ظاہرا پریشانی جو آپ کے نوکر نے دیکھی آپ پر گزرے ہوئے حادثات کی وجہ سے تھی تو پولیس کے خیال کو اور بھی تقویت ملے گی۔ وہ کہیں گے کہ حادثات ہی سے گھبرا کر آپ نے خودکشی کا ارادہ کیا۔ اور اگر آپ کی ذہنی پریشانی کی وجہ بیان نہ کی جائے تو ہمارے کیس میں جان باقی نہیں رہتی۔ پولیس نے ابھی تک میرے اس نظریہ کو اہمیت نہیں دی۔ کہ آپ نے زہر صراحی میں کیوں ڈالا۔ آپ کا ارادہ خودکشی کا تھا تو آپ زہر کو گلاس میں گھول کر پی سکتے تھے۔"

اتنے میں ڈاکٹر پھر آیا۔ اور اس کے ساتھ ایک مجسٹریٹ اور انسپکٹر پولیس بھی تھا۔ انہوں نے میرا بیان قلمبند کیا۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ حادثہ کی صبح کو میں نے صراحی میں سے ایک گلاس پانی پیا تھا اور بس۔ انسپکٹر نے مجھ پر بہت سے سوال کئے۔ جن سے اس کا

مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ آیا میں اس واقعہ سے پہلے زندگی سے تنگ آیا ہوا تھا۔ میں نے عرض کر دیا کہ مجھ پر بہت سے حادثات گزر چکے ہیں۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی میں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ میں زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔

مجسٹریٹ رخصت ہوا۔ خان بہادر اور انسپکٹر میری چارپائی سے کچھ فاصلہ پر کھڑے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ڈاکٹر اور انسپکٹر چلے گئے۔ تو خان بہادر نے کہا۔

"پولیس نے بہت تفتیش کی ہے۔ ابھی تک یہی ثابت ہو رہا ہے کہ آپ کے کوارٹر میں آپ کے پاس کسی عورت کا آنا جانا نہیں تھا۔ اور نہ اس حادثہ سے پہلے کوئی عورت آپ کے کوارٹر کے قریب دیکھی گئی۔"

مجھے یقین ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر ثریا ضرور میرے کوارٹر میں آئی۔ اور اسی نے میری صراحی میں زہر ڈالا۔ اس کے باوجود جب خان بہادر نے کہا۔ کہ ابھی تک کسی عورت پر شبہ نہیں کیا جا رہا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بلکہ یوں محسوس ہوا کہ میرے سینے سے بہت بڑا بوجھ ٹل گیا۔ انسانی زندگی کتنی پراسرار ہے۔ انسان خود اپنے آپ کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

خان بہادر کو عدالت میں جانا تھا۔ وہ ادھر تشریف لے گئے اور میں اپنے ماضی میں کھو گیا۔ ہر حادثہ کے ایک ایک جزو کی یاد تازہ

کی ۔ اور جان بوجھ کر دوبارہ اپنے دل کو دکھ پہنچایا ۔

مجھے ہسپتال میں زیادہ عرصہ نہ ٹھہرنا پڑا ۔ میں چند دن میں صحتیاب ہو گیا اور ڈاکٹر نے خان بہادر سے کہہ دیا ۔ کہ ایک آدھ دن میں مجھے ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا جائے گا ۔ میں بار بار سوچتا کہ ہسپتال سے نکلنے کے بعد کہاں جاؤں گا ۔ خان بہادر کے دل میں خدا نے خوف ڈال دیا ۔ اور وہ محض انسانی ہمدردی کی وجہ سے میرے لیئے فرشتۂ رحمت ثابت ہوئے ۔ میرا ان کو مزید پریشان کرنا کسی طرح روا نہیں ۔ شہر میں کوئی ٹھکانہ نہیں جہاں میں سر چھپا سکوں ۔ گاؤں میں مکان موجود ہے ۔ لیکن زمین بیچ دینے سے برادری کی نظر میں ذلیل ہو چکا ہوں ۔ وہاں اب میری دال نہیں گلے گی ۔ کوارٹر میں رہ سکنا صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ میری ملازمت برقرار رہے ۔ اور اس کی امید نہیں ۔

میں انہیں خیالات میں غلطاں تھا کہ زنانہ ہسپتال کا چپڑاسی میرے نام ایک چٹھی لایا ۔ میرے دستخط لے کر اس نے چٹھی میرے حوالہ کی اور پیشتر اس کے کہ میں زنانہ ہسپتال اور دفتر کے متعلق پوچھتا ۔ وہ جا چکا تھا ۔ چٹھی کھول کر پڑھی تو یوں معلوم ہوا کہ دل پر کسی نے گولی مار دی ۔ ملازمت سے میرے برطرف کیئے جانے کی یہ سرکاری اطلاع تھی ۔ میں دیر تک اس چٹھی کو اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا ۔ آخر اسے ملفوف کر کے تکیہ کے نیچے رکھا اور آنکھیں بند کر لیں ۔

میں سوچنے لگا کہ انسان امید کے سہارے زندہ ہے۔ اِسے مستقبل ہمیشہ حسین اور خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ اس پر مصیبت نازل ہو۔ تو وہ سمجھتا ہے کہ صرف اس مصیبت کے ٹل جانے پر راحت ہی راحت ہے۔ اُسے کبھی یہ خیال نہیں آتا۔ کہ ہو سکتا ہے یہ مصیبت آئندہ لامتناہی مصیبتوں کا پیش خیمہ ہو۔ موت ہی کے نام سے اسے ڈر لگتا ہے۔ موت کو وہ ایک ڈاکو سمجھتا ہے۔ جو اسے مستقبل میں حائل ہونے والی مسرتوں سے محروم کر دینا چاہتا ہے انسان ایڑیاں رگڑتا ہے۔ مصیبت پر مصیبت اٹھاتا ہے۔ لیکن جیئے جاتا ہے۔ کتنے مصیبت زدہ لوگ ہیں جو مستقبل میں حاصل ہونے والی موہوم خوشی کی امید پر زندگی بسر کر دیتے ہیں۔ اور خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ انہیں زندگی کے ہر مرحلہ پر موت کو اپنا بہترین دوست تصور کرنا چاہیئے۔ اگر وہ مستقبل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں تو یقیناً وہ موت کے پیچھے بھاگیں۔ اور منت خوشامد سے اُسے منا کر لائیں۔ لیکن مستقبل پردۂ غیب میں ہے۔ اور انسان برابر دھوکا کھائے جاتا ہے۔ میں نے بھی مستقبل کے متعلق امیدوں کی ایک عالیشان عمارت تیار کی۔ اس عمارت کو جب بھی دور سے دیکھا فخر سے میری گردن بلند ہو گئی۔ لیکن جتنا اس کے قریب آنے کی کوشش کی اتنا ہی دور دھکیل دیا گیا۔ اب میں اس عمارت سے اتنا دُور کر دیا گیا تھا کہ وہ محض حدِ نظر کے طور پر دکھائی دے رہی تھی

اور لبس!

باپ کی خون پسینہ ایک کر کے پیدا کی ہوئی جائداد میں نے تباہ کر دی۔ میرے ارادے پست نہ ہوئے۔ ایک دوست نے غداری کی۔ میرے پروگرام پر اثر نہ ہوا۔ اوشا میری امید کا مرکز تھی دائرہ مرکز کے بغیر قائم نہیں رہتا۔ میرا دائرہ مرکز سے دور ہٹ جانے پر بھی قائم رہا۔ ثریا نے مجھے زہر دیا۔ میں نے اپنے طرزِ زندگی پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ میں نے ان سارے حادثات کا مقابلہ بڑی جوانمردی سے کیا۔ اور اپنے آپ کو ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ ثابت کیا۔ لیکن ملازمت کے چھن جانے پر صبر کا پیالہ لبریز ہو گیا۔ میرے ارادوں کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔ مستقبل کی دلفریبی ایک کھردری حقیقت نظر آنے لگی۔ مرد بھیڑیئے نظر آنے لگے۔ عورتوں کو میں خدا کا مجسم عذاب سمجھنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے اپنی زندگی پر ایک خشک مزاج منصف کی طرح بڑی بے دردی سے نظر ڈالی۔ اور اس کی گہرائیوں کو دیکھ ڈالا۔ انسانی زندگی ایک مسلسل خود فریبی دکھائی دی۔ اس کا ایک لمحہ مجھے معصومیت کے خون سے داغدار نظر آیا۔ میں نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور دانت پیسنے لگا۔ مجھے اپنے آپ پر سخت غصہ آیا۔ میں اپنے آپ سے نفرت کرنے لگا۔ کیا اسی نام نہاد زندگی سے مجھے محبت رہی ہے کیا اسی کی خاطر لمبے چوڑے پروگرام بناتا رہا ہوں ہ میں کتنا بیوقوف تھا۔ میری

حماقت کی کوئی حد نہ تھی۔ اپنے آپ کو کوسنے کے بعد میں نے زندگی پر لعنت بھیجی اور اس کا منہ چڑایا۔

دوسرے دن چند لمحوں کے لئے خان بہادر پھر تشریف لائے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ پولیس یہ یقین کر لینے پر بضد ہے کہ زہر میں نے خود کھایا اور خودکشی کرنے کے لئے کھایا۔ خان بہادر نے مجھے تسلی دی کہ وہ میرے لئے اپنی پوری طاقت سے مقدمہ لڑیں گے لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ ممکن ہے مجھے قید بھگتنی پڑے۔ کیونکہ میرے حق میں صرف کسی عورت کی گواہی اور زہر کا صراحی میں حل ہونا ہے۔ لیکن میرے بیشمار حادثات اور میرے نوکر کا بیان میرے خلاف ہے عدالت کا پولیس کی رائے سے اتفاق کر جانا بعید از امکان نہیں خان بہادر نے مجھے تسلی دی۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ ان کے پہلے رویہ اور موجودہ رویہ میں بہت فرق ہے۔ وہ میری مدد کرتے کرتے تنگ آ گئے معلوم ہوتے تھے۔

ہسپتال میں میرے تیماردار خان بہادر اور ان کے دو کلرک تھے۔ ایڈیٹر "انسان" بھی تین چار مرتبہ آئے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ مجھے زہر دیئے جانے کے واقعہ کو اخبارات نے بہت اہمیت دی اور چھ کالمی سرخیوں سے اس خبر کو شائع کیا۔ اس نے مجھے بتایا۔ کہ تمام اخبارات نے اشارۃً یہی رائے ظاہر کی ہے۔ کہ ادشا سے اختلاف ہو جانے کی وجہ سے میں نے خودکشی کرنے کی خاطر زہر کھا لیا۔ مجھے اخبارات

کے اس رویّہ پر سخت تعجب ہوا۔ اور ایڈیٹر "انسان" سے درخواست کی کہ وہ اس رائے کی تردید کر دیں۔ انہوں نے یہ کہہ کر مجھے خاموش کر دیا۔ کہ اس آگ کو دوبارہ ہوا دینا ٹھیک نہیں۔ بات اب رفت گزشت ہو چکی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اسے دوبارہ نہ اٹھایا جائے۔

ہسپتال کا چپڑاسی دو ایک مرتبہ آیا اور سلام کر کے چلا گیا۔ نرس دو مرتبہ میری عیادت کو آئی۔ دونوں دفعہ اس کی حالت غیر تھی۔ وہ میرے پاس بیٹھتی تو اس وقت بھی اس کی نظر دروازہ کی طرف رہتی اس کی باتوں میں ترتیب نہ ہوتی۔ وہ بعض دفعہ گفتگو میں مصنوعی طور پر مسکرانے کی کوشش کرتی۔ حالانکہ اس موقع پر مسکرانا بالکل بے معنی ہوتا اس میں ایک خاص قسم کی بے تابی نظر آتی۔ جسے وہ چھپانے کی ناکام کوشش کرتی۔ مجھ سے اس کی کشمکش نہ دیکھی جاتی اور میں کسی نہ کسی بہانہ سے اُسے جلد رخصت کر دیتا۔ اس کی ان حرکات سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اسے معلوم ہے ثریا کو مجھ سے محبّت تھی اور وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اب اسی نے مجھے زہر دے دیا ہے۔ میں نے خیال کیا کہ نرس بڑی نیک دل اور منصف مزاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے مجھ سے گہری ہمدردی ہے۔

آخر ہسپتال سے مجھے ڈسچارج کر دیا گیا۔ اسی وقت عقب میں سے نکل کر سب انسپکٹر پولیس نے ایک سپاہی کو مجھے ہتھکڑی لگانے کا حکم دے دیا۔ میں نے وجہ دریافت کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں نے خودکشی

کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور ایسی کوشش جرم ہے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ سپاہی نے انہیں ہتھکڑی پہنا دی اور مجھے حوالات میں لے گیا۔

میں نے حوالات میں اپنی گرفتاری پر غور کیا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ میں نے اپنے بُرے حالات سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کی کوشش کی اور حکومت نہیں چاہتی کہ کوئی شخص خودکشی کرے۔ تو وہ ایسے حالات کو روکنے کی کوشش کیوں نہیں کرتی جن کے پیدا ہو جانے سے آدمی خودکشی کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگر حکومت کو یقین ہے کہ میں نے دیدہ و دانستہ خودکشی کی ٹھانی تھی۔ تو اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ میرے ان حالات کی چھان بین کی جائے جنہوں نے مجھے خودکشی پر مجبور کیا۔ ان حالات کے دُور ہو جانے سے خودکشی کا خیال خود بخود میرے ذہن سے نکل جائیگا۔ میرے گرفتار ہونے یا جیل میں ٹھونسے جانے پر ان بُرے حالات میں اضافہ ہی ہوگا۔ کمی ہرگز نہیں ہوگی۔ میں جب تک قید میں رہوں گا۔ خودکشی نہیں کر سکوں گا۔ لیکن جیل سے باہر آنے پر ان حالات کو اور بھی بھیانک صورت میں دیکھونگا۔ اگر میں پھر خودکشی کر لوں تو کوئی کیا کر سکے گا؟ تو گویا مجھے گرفتار اس لئے نہیں کیا گیا کہ میری خودکشی کا علاج کیا جائے گا۔ بلکہ مجھے سزا دی جائے گی کہ میں خودکشی کرنے میں کامیاب کیوں نہ ہوا۔ میں خودکشی کر کے مر جاتا تو پھر قانون کی گرفت سے آزاد ہو جاتا۔ لیکن مرا نہیں۔ میری کوشش ناکام رہی۔ اب مجھے جیل کی ہوا کھانا ضروری ہے

اسے کہتے ہیں مارون گھٹنا پھوٹے آنکھ۔

پولیس نے مجھے کہہ دیا کہ عنقریب میرا مقدمہ عدالت میں پیش ہوگا۔ اور غالباً پہلی ہی پیشی پر فیصلہ ہو جائے گا۔

جیل میں خودکشی

میں اس ذکر کو چھوڑتا ہوں کہ جیل میں مجھے کیا تکلیفیں پہنچیں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس دوران میں میرے ارادے پست سے پست تر ہوتے گئے۔ زندگی مجھے ایک عذاب نظر آنے لگی میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کی ترکیبیں سوچنی شروع کر دیں۔ ایک دفعہ پھر میں نے اپنے ماضی حال اور مستقبل پر نگاہ ڈالی۔ ماضی خود فریبیوں کی داستان حال مصیبتوں کا ڈرامہ اور مستقبل ایک پرسوز مرثیہ معلوم ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے زندہ رہنے یا مر جانے سے دنیا پر کوئی اثر نہیں پڑیگا میری زندگی موت ہے اور موت زندگی۔ نہ اس کے کچھ معنے ہیں۔ نہ اُس کے۔ دنیا کی زبان میں صرف دو لفظ مہمل ہیں۔ زندگی اور موت کم ازکم میری زندگی اور موت کے کچھ معنی نہیں۔ میں سانس لیتا ہوں ہوا کی لہروں میں تموج پیدا ہو جاتا ہے۔ میری زندگی کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں۔ لاؤ اس بے حقیقت چیز کو ٹھکانے لگا دیں۔ میں نے

فیصلہ کر لیا کہ میں مروں گا اور جس قدر جلد ممکن ہوا مروں گا۔ مجھے اس جرم میں پکڑا گیا ہے کہ میں نے خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ سو فیصد کی جھوٹ ہے۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ میں اب خودکشی کروں گا اور حکومت کا کوئی قانون مجھے اس سے نہیں روک سکے گا۔ میں خودکشی کروں گا اور ضرور کروں گا۔

دماغ کو ذرا سکون ہوا تو میں نے خودکشی کرنے کے طریقوں پر غور کرنا شروع کیا۔ دریا میں کود کر جان دیدوں؟ مگر شہر سے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے! کیا مرنے کے لئے بھی اتنی کوشش درکار ہے؟ تو پھر چھرا پیٹ میں گھونپ لوں۔ دریا میں کودنے کی نسبت یہ ترکیب بہتر ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ میں پوری طرح چھرا نہ گھونپ سکوں۔ اور نیم جان ہو کر رہ جاؤں۔ اور پھر جیل اور عدالت کے مرحلوں سے گزرنا پڑے گا۔ تو زہر کھاؤں؟ یہ بہترین ترکیب ہے۔ زہر کھاؤ۔ دروازہ بند کر کے اندر لیٹ رہو۔ قصہ ختم۔ مجھ پر الزام بھی تو یہی ہے کہ میں نے زہر کھایا تھا کیوں نہ زہر ہی سے اپنا خاتمہ کیا جائے۔ میرا زہر کھانا قانون کو ایک قسم کا چیلنج ہوگا۔ یہ ثابت ہو جائے گا کہ زہر کھلائے جانے اور زہر کھانے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ زہر کھلایا جانا قانون کی زد میں لا سکتا ہے۔ زہر کھانا قانون کے حرکت میں آنے سے پہلے اسے شکست دے چکا ہوگا۔ زہر کہاں سے مہیا کیا جائے؟ اس کے لئے کوشش کرنا پڑے گی۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ زہر زنانہ ہسپتال سے ہی چرایا جائے۔ ثریا نے زہر وہیں

سے ۔۔۔ لے کر میری صراحی میں ڈالا ہوگا۔ میں بھی اسی زہر سے خودکشی کرونگا۔
کتنا دلچسپ خیال ہے۔ ثریا کے دیئے ہوئے زہر نے مجھے ہتھکڑی پہنا
دی۔ اور مجرم بنا کر جیل بھجوا دیا۔ اسی بوتل سے نکالا ہوا زہر مجھے دنیا کی ہر
پابندی سے آزاد کر دیگا جیل تک جانے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

ثریا کا نام ذہن میں آتے ہی خیالات نے پھر پلٹا کھایا۔ اس نے
اشرف سے شادی کی ہے۔ اشرف ایک دھوکے باز اور فریبی آدمی
ہے۔ اس کے باپ کا بیان ہے کہ وہ روپیہ ہتھیانے کی خاطر ہر قسم کے
پاپڑ بیل لیتا ہے۔ اس نے ثریا سے صرف اس کے روپیہ کی وجہ سے شادی
کی ہے۔ یہ شادی کامیاب نہیں ہو سکتی اس کا انجام دیکھنا چاہیئے۔ میرے
سوا ان دونوں کے صحیح حالات کوئی نہیں جانتا۔ میں مر گیا تو دنیا میں ایک
بھی شخص ایسا نہیں ہوگا۔ جو ان کے انجام پر صحیح تبصرہ کر سکے۔ اور دوسروں
کو اصل حالات بتا سکے۔ عورت کتنی کمزور جنس ہے۔ کیا اور عورتیں بھی اتنی
ہی کمزور ہوتی ہیں؟ کیوں نہیں۔ ادشا بھی تو کمزور ہی ثابت ہوئی۔
یاد آ گیا۔ میں نے دیہات کی تنظیم کی تھی۔ دیہاتی لوگ ایک خاص ڈگر
پر چلنے والے ہیں۔ اگرچہ دیہاتی شاخیں مرکزی انجمن سے ملحق ہیں لیکن
ادشا دیہاتی ذہنیت سے واقف نہیں۔ وہ ان کی رہنمائی نہیں کر سکے گی۔

یہ صورت بہت دلچسپ ہے۔ کیا ادشا ان پر اپنا نیا پروگرام ۔۔۔۔
ٹھونسنے کی کوشش کریگی۔ یا اپنے آپ کو ان کے ۔۔۔۔ رنگ میں
ڈھال کر ان لوگوں کی ترجمانی کرے گی۔ ان دونوں صورتوں میں سے ایک

صورت بھی اس کے لئے ممکن نہیں۔ اس کی یہ کشمکش دیکھنے کے قابل ہے۔ اور میں ہی اس کشمکش کو صحیح طور پر سمجھ سکتا ہوں۔ دنیا میں کوئی دوسرا آدمی اسے صحیح طور پر سمجھنے والا موجود نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر ایک کانفرنس سے گھبرا کر وزیر اعظم نے گورنر کی پناہ لی۔ اور گورنر نے رائے بہادر کو سمجھا بجھا یا کہ وہ اپنی لڑکی کو وزیر اعظم کے خلاف کسی تحریک میں حصہ نہ لینے دے۔ جس پر ادشا مجبور ہو گئی۔ تو اسمبلی کے آئندہ انتخاب میں اگر سچ مچ ہی وزیر اعظم کی پوزیشن کمزور ہو گئی۔ اور ادھر پھر اس نے گورنر کی طرف رجوع کیا۔ اور ادھر ساری دیہاتی آبادی نے اس کے خلاف فیصلہ کر دیا تو صورت حال کتنی دلچسپ ہو گی۔ ادشا جو چاہے کرے۔ دیہاتی آبادی اب وزیر اعظم کے ہتھے میں آنے سے رہی۔ لیکن اگر میں ہی اس دنیا میں موجود نہ ہوا تو اس تماشہ کا مزا کون اٹھائے گا۔ کون وزیر اعظم کو کھری کھری سنائے گا۔ کون اس سے گذشتہ بدعنوانیوں کا جواب مانگے گا۔ یہی نہیں میرے سوا اور کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ جو صوبہ کا انتظام پوری دیانتداری سے کر سکے۔ اگر میں مر گیا تو جو شخص بھی وزیر اعظم بنے گا۔ وہ سیکرٹریوں کے اختیارات میں دخل نہیں دیگا سیکرٹری اخلاق باختہ اور راشی ہونگے۔ ان کے پرسنل اسسٹنٹ سائلوں کو سیکرٹریوں کی رنگین مزاجی سے فائدہ اٹھانے کی دعوت دینگے جو مظلوم لوگ یہ رشوت پیش نہیں کر سکیں گے۔ ان کی شنوائی نہیں ہوگی نتیجہ یہی ہوگا۔ کہ بددیانت سپرنٹنڈنٹ مستحق کلرکوں کو چار چار مرتبہ پیچھے

کلرکی کے حق سے بلا وجہ محروم رکھیں گے۔ صوبہ کا انتظام کھوکھلا ہوتا جائیگا انسانیت کی جڑ کٹتی رہے گی۔ اور غریبوں کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔ یہ سب کچھ کیوں جاری رہیگا محض اس لئے کہ میں مرچکا ہونگا۔ نہیں مجھے ہرگز نہیں مرنا چاہیئے۔ اگر اپنی خاطر نہیں تو صوبہ کی خاطر زندہ رہنا چاہیئے صوبہ کو موجودہ حالت میں چھوڑ کر مرجانا صریح بے انصافی ہے۔ میں ساری دنیا کا شاکی محض اس لئے ہوں کہ وہ بے انصاف ہے۔ اس مرحلہ پر اگر میں بھی بے انصافی ہی کروں تو مجھ میں اور ان لوگوں میں کیا فرق ہے جنہیں میں بددیانت اور مطلب پرست شمار کرتا ہوں۔ میں نہیں مرونگا اور ہرگز نہیں مروں گا۔

پھر تصویر کا دوسرا رُخ میرے سامنے آیا۔ میں بے زر ہوں۔ بے یار و مددگار ہوں۔ سر چھپانے کو جگہ نہیں۔ ملازمت چھین لی گئی۔ جیل کی کوٹھری میں بند کردیا گیا۔ یہاں کب تک سڑتا رہوں۔ یہ خدا ہی جانے۔ یہ صورت حال اور وزیر اعظم بننے کے خواب! آخر میری سمجھ کو کیا ہوگیا ہے؟ وزیر اعظم بننے کیلئے سرمایہ۔ طاقت۔ جماعت اور آزادی کی ضرورت ہے۔ میرے پاس ان میں سے ایک بھی نہیں۔ وزیر اعظم بننے کی صرف خواہش موجود ہے جب میرے حالات اتنے مہیب اور بھیانک ہیں۔ تو یہ خواہش میرے دل میں کیسے پیدا ہوگئی ہے؟ ان حادثات کے رونما ہونے سے پہلے میں ایک کلرک تھا۔ کلرک اپنی خواہش کو پھیلاتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ وہ وزارت عظمیٰ کو بھی اپنے دامن میں لپیٹ لے۔ یہ تعجب کی بات ہے!

کہتے ہیں ذرّے ذرّے پر خدا کا تصرف ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر پتّہ نہیں ہلتا وہ جو چاہتا ہے ہوتا ہے دنیا کا سارا کارخانہ اس کے اشارہ پر چل رہا ہے۔ ہماری ہر حرکت اس کی حکمت پر مبنی ہے۔ وہ علیم ہے اور خبیر ہے۔ کیا میرے دل کی خواہش اس کے علم میں نہیں۔ کیا یہ اس کی پیدا کردہ نہیں ؟ اس خواہش کو پیدا کر دینے کے بعد مجھے کمر توڑ دینے والے حادثات سے دوچار کر دینا ہرگز حکمت نہیں۔ میری خواہش اور میرے حالات دو متضاد چیزیں ہیں۔ ان میں کوئی ربط نہیں۔ کوئی تعلق نہیں۔ کم از کم مجھے ان میں کوئی رشتہ نظر نہیں آتا۔ تصنیف کے دو متضاد حصوں میں اس کا مصنف ہی ربط ثابت کر سکتا ہے۔ میری خواہش اور میرے حالات خدا کی تصنیف کا وہ متضاد بیان ہیں۔ کیوں نہ اس کے مصنف سے کہوں کہ وہ بتائے۔ ان میں کس طرح تعلق تلاش کیا جا سکتا ہے۔

میں زندگی اور موت کو یکجا اکٹھا نہیں کر سکتا۔ میرے لئے مرنے کے سوا چارۂ کار نہیں۔ لیکن مجھے زندہ رہنا چاہیئے۔ میرے زندہ رہے بغیر صوبہ کی حالت نہیں بدل سکتی۔ میں مر نہیں سکتا۔ مجھے موت قبول نہیں۔ میرے اللہ میں کیا کروں۔ موت اور زندگی کو کس طرح بیک وقت اپنے آپ پر وارد کر لوں۔ وہ کونسی صورت ہو کہ میرے دل کی خواہش پوری ہو جائے۔ اور میں زندہ رہوں۔ ساتھ ہی میرے حالات کا تقاضہ کہ میں مر جاؤں ادھورا نہ رہے۔ میں کمزور سا انسان

ہوں۔ نہ مر سکتا ہوں نہ زندہ رہ سکتا ہوں۔ موت اور زندگی کو یکجا کر سکتا تو بڑی بات ہے مجھے ان دو میں سے ایک پر بھی اس وقت اختیار نہیں۔

میرے جسم میں جھرجھری سی ہوئی خون میں چیونٹیاں سی دوڑنے لگیں جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے ایک لمحہ کے لئے سانس بالکل رُک گیا۔ اور دل کی دھڑکن جسم کی جھرجھری میں غلط ملط ہو گئی۔ دل اور دماغ کے درمیان ایک تار ہلا۔ اور میرا سوال حل ہو گیا۔ میں نے زندگی اور موت کو یکجا کر دیا تھا۔

جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں میرا سر بوسیدہ فرش پر جھک گیا مجھ پر رقت طاری ہوئی آنکھوں سے چشمہ ابل پڑا۔ اور میں نے اپنے آپ کو یہ کہتے سنا۔

"اے خدا! تو گواہ رہ کہ آج اس وقت سے میں اپنے آپ پر موت وارد کرتا ہوں۔ میں اپنی ہر اس خواہش، اپنی ہر اس تمنا کا گلہ گھونٹتا ہوں جس کا تعلق میری ذات سے ہے۔ میں اپنے لئے مر چکا۔ میری ذات فنا ہو گئی۔ میرے ارادے مٹ گئے اور میں اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں دفن کر دیا۔ اے قادر و کریم! جو کچھ میرا تھا۔ وہ ختم ہوا۔ میں نے اس کا نام و نشان تک باقی نہیں چھوڑا۔ لیکن جو چیز تیری ہے بس ننگی تلوار بن کر اس کی نگہبانی کروں گا۔ میں تیرے ارادوں کو پورا

کرنے اور دنیا کو تیری مرضی کے مطابق ڈھالنے میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ صرف کر دونگا۔ میرے دائرہ اثر میں تیری اور صرف تیری حکومت ہوگی۔ تیرا قانون نافذ ہوگا اور تیرے نام کا سکہ چلے گا۔ میرے اس دائرہ کو وسعت دینا یا تنگ کرنا تیرا کام ہے۔ میں بہر صورت تیری دی ہوئی زندگی کو تیرا ہی مقصد حاصل کرنے کے لیئے وقف کرتا ہوں۔

میں نہیں کہتا کہ تو میرے گذشتہ گناہ بخش۔ میرے ماضی کے متعلق جس طرح تیری رضا ہو تو مجھ سے معاملہ کر لیکن مستقبل میں تو میرے ارادہ دل پر کڑی نگاہ رکھ۔ اگر میں چوکنے لگوں تو مجھے تازیانہ مار کر ہشیار کر دے اور مجھ سے پورا مواخذہ کر۔ اور مجھے جتا دے کہ میں نے اپنا عہد پورا نہیں کیا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میرا فیصلہ اٹل ہے اور میرا ارادہ ناقابل شکست تو ان میں برکت ڈال اور اپنے لیئے انہیں زیادہ سے زیادہ مفید بنا جو میرا ہے وہ ختم ہوا۔ اس پر ابدی موت کی مہر ثبت کر۔ اشرف۔ اشتیاق، اشتیاقیہ سب کا تعلق میری ذات سے تھا۔ میری ذات کے ختم ہونے ہی یہ تعلق بھی ختم ہوا۔ مردہ اپنے دشمنوں سے انتقام نہیں لے سکتا۔ میں مر چکا ہوں۔ میں ان سے بدلہ نہیں لونگا۔ لوگوں کو میں اپنی یاد سے اس طرح محو کرتا ہوں جس طرح میں نے اپنے آپ کو محو کر دیا ہے۔ تو مجھے جیل میں رکھ۔ آزاد کر۔ ہسپتال میں بھیج یا وزیر اعظم بنا۔ یہ تیرا کام ہے۔ میں اپنے وعدہ کی پوری پابندی کروں گا۔ آج سے میں ننگی تلوار ہوں تو مجھے کبھی نیام میں نہیں دیکھے گا۔ میری کاٹ دوہری ہوگی۔ جو میری زد

میں آئے گا۔ میں اس بے دردی کے ساتھ اسے ٹکڑے ٹکڑے کروں گا جس بے دردی سے میں نے آج اپنے آپ کو مٹایا ہے۔

میں نے اپنے آپ کو صرف اسی قدر کہتے سنا۔ اس کے بعد کچھ کہا یا نہیں یہ مجھے یاد نہیں۔ میں سجدہ ہی میں تھا کہ مجھے نیند آگئی۔ جب مجھے جاگ آئی تو میں نے اپنے آپ کو کوٹھڑی کے اسی بوسیدہ فرش پر پایا۔ میری طبیعت میں بالکل سکون تھا۔ جسم ہلکا پھلکا تھا۔ اور ہر فکر میرے ذہن سے دور ہو چکا تھا۔

دنیا میں خودکشی کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ہم آئے دن اخبارات میں پڑھتے سنتے ہیں۔ کہ فلاں آدمی نے دریا میں کود کر خودکشی کر لی۔ فلاں عورت نے چھت سے رسی باندھ کر اپنی گردن میں پھندا ڈال لیا۔ فلاں شخص نے زہر کھا لیا۔ خودکشی کی ان وارداتوں کے پس پردہ کیا کیا مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ان سے یہاں بحث نہیں۔ صرف اتنی بات ہے کہ خودکشی کا عام طریقہ یہی ہے کہ اپنے جسم سے روح کو جدا کرنے کا سامان پیدا کر دیا اور ہمیشہ کے لیئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جب اس قسم کا کوئی واقعہ ظہور میں آتا ہے۔ تو اخبارات انہیں نمایاں طور پر شائع کرتے اور لوگ بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ میں نے بھی خودکشی کی مجھے ڈوب مرنے کے لیئے دریا تک نہ جانا پڑا۔ زہر خریدنا نہ پڑا۔ رسی کا پھندا بنانے تک نوبت نہ آئی۔ میرا کام کتنا سہل ہو گیا۔ لیکن عام خودکشی کرنے والے لوگ آئندہ کے لیئے اس دنیا کی ہر مصیبت اور زندگی کی کشمکش سے

جھوٹ جاتے ہیں۔ میں نے خودکشی کی اور اس طرح خودکشی کی کہ اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے ایک مسلسل آزمائش میں ڈال دیا۔ کون نہیں جانتا زندگی میں قدم قدم پر ہمیں برائی سے دوچار ہونا پڑتا ہے جگہ جگہ مصلحت کو مدنظر رکھ کر جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ ہم اگر ایک مجبوری میں ایمانداری سے ثابت قدم رہتے ہیں۔ تو دس مجبوریاں ہم سے انسانیت سوز گناہ کرا دیتی ہیں۔ زندہ رہنا اور پھر کسی مجبوری، کسی مصلحت کسی طاقت کے سامنے نہ جھکنا کتنا دشوار کام ہے۔ اگر کسی کو اس کے دشوار ہونے میں کلام ہو تو وہ سامنے آئے۔ گریبان میں منہ ڈال کر دیکھے اور بتلائے کہ وہ کتنے آزمائش کے موقعوں پر ثابت قدم رہا۔ اور کتنی مرتبہ اوندھے منہ گرا۔ جب تک انسان میں حس ہے۔ وہ ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کا متاثر ہونا اس بات کی علامت ہے کہ وہ ضرور لغزش کھائے گا۔ یہ فیصلہ کرنا کہ میں لغزش نہیں کھاؤں گا۔ اپنے اندر یہ مطلب رکھتا ہے۔ کہ میں اپنے آپ پر ماحول کا اثر نہیں ہونے دونگا میں اپنے دل کو برے ماحول میں بے حس بنا دونگا۔ مجھ سے کوئی بدی سرزد نہ ہوگی۔ اس کے لئے کتنی ہمت اور جرأت کی ضرورت ہے مگر میں نے خودکشی کر لی۔ اور اس رنگ میں خودکشی کر لی۔ میں جانتا ہوں کہ میری خودکشی کی خبر کسی اخبار تک نہیں پہنچے گی۔ اخبار نویس اس واقعہ کو جلی عنوان سے شائع نہیں کریں گے۔ میں ان کے سامنے جاؤنگا۔ تو وہ ہرگز یہ نہیں سمجھ سکیں گے کہ میں وہ شخص ہوں۔ جو خودکشی کر چکا ہے۔ یہ کتنی

عجیب خودکشی ہے۔ اپنی قسم کی پہلی خودکشی۔ میں اس خودکشی کا موجد ہوں
مجھے یہ ہمیشہ فخر رہے گا۔

نرس کا بیان

مجھے بتایا گیا تھا کہ منگل کے دن دس بجے مجھے مجسٹریٹ کے روبرو پیش کیا جائے گا۔ اس دن میں انتظار کرتا رہا۔ کہ مجھے کب عدالت میں لے جایا جاتا ہے۔ بار بار دروازہ کی طرف آنکھ اٹھتی۔ اور کان آہٹ سننے کی کوشش کرتے۔ وقت گزرتا گیا۔ اور میں کوٹھڑی میں بدستور بند رہا۔ شام کے پانچ بجے کے قریب داروغہ جیل کی معیت میں خان بہادر تشریف لائے۔ داروغہ جیل نے مجھے کوٹھڑی سے باہر آنے کو کہا۔ میں باہر آگیا۔ خان بہادر کا جھریوں والا چہرہ خوشی کی رقص گاہ بن رہا تھا۔ انہوں نے خلاف معمول مجھے اپنے آپ سے چمٹاتے ہوئے کہا۔

"مجسٹریٹ حکم نامہ پر دستخط نہیں کر سکا۔ اس لئے دیر ہو گئی ہے۔"

میرے پلے خاک بھی نہ پڑا۔ میرے چہرہ پر لاعلمی اور حیرانی کے آثار دیکھ کر خان بہادر نے اپنی غلطی محسوس کی۔ بولے۔

"آپ کی برّیت ہو گئی۔ پولیس کو اس باب میں یقین ہو گیا کہ زہر آپ نے

خود نہیں کھایا۔ بلکہ نرس نے آپ کی صراحی میں ڈالا تھا۔ آپ کو فوراً رہا کردینے کے لئے پولیس نے لکھا تھا۔ مگر کاغذات عدالت میں دیر سے پہنچے۔ مجسٹریٹ کے دستخط نہ ہو سکے۔ اس لئے اب آپ کل رہا ہوں گے۔"

میں نے عرض کیا۔

"آپ نے مجھ سے ملنے کا فیصلہ یہ معلوم ہونے کے بعد ہی کیا ہوگا کہ میں پولیس کی نظر میں مجرم نہیں رہا۔ مجھ سے ملنے کے لئے مجسٹریٹ سے اجازت لیتے وقت شاید آپ کو وہ کاغذات یاد نہیں رہے ہوں گے۔ ورنہ دونوں کام اکٹھے ہو جاتے۔ بہرحال میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ میرے محسن ہیں۔ میں تمام عمر آپ کے احسانات نہیں بھولوں گا۔"

خان بہادر نے جواب دیا۔

"شکریہ کی ضرورت نہیں میں عدالت سے اجازت لے کر یہاں نہیں آیا۔ بلکہ داروغہ صاحب میرے دوست ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے مجھے مجسٹریٹ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔"

خان بہادر میرے بزرگ تھے۔ میرے محسن تھے۔ ان کے سامنے میری آنکھ نہ اٹھتی تھی۔ اس حادثہ میں انہوں نے جو احسان مجھ پر کیا۔ اس سے میری زبان اور بھی گنگ ہو جانی چاہیے تھی۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں وہ نشیم نہیں۔ خان بہادر سے جس کے تعلقات نیاز مندانہ

اب بھی خان بہادر کی عزت میرے دل میں بدستور موجود تھی۔ مگر وہ مجھے قدرت کے آلۂ کار نظر آ رہے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ سب انسان قدرت کی چلتی پھرتی مشینیں ہیں۔ قدرت جس طرح چاہتی ہے انہیں استعمال کر لیتی ہے۔ میں نے خان بہادر سے مخاطب ہو کر عرض کیا "کیا مجسٹریٹ کی اجازت کے بغیر قیدیوں سے ملنے کی اجازت ہر شخص کو ہے۔"

خان بہادر "یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہر شخص کو اجازت مل جائے؟ میں نے ابھی بتایا ہے کہ داروغہ صاحب ہمارے دوست ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ خاص رعایت حاصل ہے۔"

میں "دوسرے لفظوں میں آپ کا مطلب یہ ہے کہ داروغہ صاحب بہت کمزور آدمی ہیں۔ یہ اپنا فرض ایمانداری سے ادا نہیں کر سکتے۔ ہمیں ایسا نظام بدلنا پڑے گا جس میں ہر شخص سے مساوی سلوک نہ ہو۔"

خان بہادر نے حیرانی اور غصہ کے ملے جلے جذبات کے ماتحت کھانس کر داروغہ جیل سے کہا۔

"بیچارہ لینٹیبر! اس پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہیں۔ لمبا عرصہ درکار ہے کہ اس کا دماغ اعتدال پر آئے۔"

داروغہ جیل نے ایک ہلکا خوشامدانہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ پاگل پن اس میں آج ہی پیدا ہوا ہے۔ آج سے پہلے بشیر بالکل ٹھیک تھا۔ جب سے یہ جیل میں آیا ہے۔ میں روزانہ اسے دیکھتا رہا ہوں۔"

ہم آہستہ آہستہ چلتے داروغہ جیل کے دفتر میں آ گئے۔ خان بہادر بیٹھ گئے تو داروغہ جیل نے مجھے بھی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ میں شگون اور فال کا نہ پہلے قائل تھا نہ اب قائل ہوں۔ لیکن جب داروغہ نے مجھے کرسی پیش کی تو میرے دل میں آیا کہ یہ کرسی محض لکڑی کی کرسی نہیں بلکہ یہ کرسی اس عزت کی مادی صورت ہے۔ جو مجھے حاصل ہونے والی ہے ہم بیٹھے ہی تھے۔ کہ داروغہ جیل نے خان بہادر سے پوچھا۔

"ہاں تو آپ فرما رہے تھے کہ اس نے کہا" ڈاک سے" پھر کیا ہوا؟"

خان بہادر نے کہا۔

"بشیر ابھی داروغہ صاحب کو بتا رہا تھا۔ کہ نرس نے کس طرح تمہیں زہر دیا۔"

میں نے عرض کیا۔

"مجھے بھی بتایئے میں سننا چاہتا ہوں۔ نرس سے میرا کوئی واسطہ نہ تھا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ مجھے زہر دیتی۔"

خان بہادر۔ "معلوم ہوا ہے کہ ہسپتال کی نرس مسز لارنس کل دوپہر کا کھانا کھانے کے تھوڑی دیر بعد بے ہوش ہو گئی۔ اس کا نوکر گھبرا کر اسسٹنٹ ڈاکٹر

ڈاکٹر کے یہاں پہنچا۔ لیڈی ڈاکٹر فوراً نرس کے گھر گئی۔ اسے جلدی سے ہسپتال پہنچا یا گیا۔ مردانہ ہسپتال کے بھی ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر کے بلوا لیا گیا۔ لیکن دو ڈاکٹروں کی انتہائی کوشش سے بھی نرس نہ بچ سکی۔ جب نرس کی حالت تشویشناک سمجھی گئی۔ تو مجسٹریٹ کو اطلاع کر دی گئی۔ وہ بیان لینے کے لئے آیا۔ نرس بالکل بے ہوش تھی۔ زہر اپنا کام کر چکا تھا۔ آخری وقت میں نرس نے صرف ایک لمحہ کے لئے آنکھیں کھولیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ خدا نے آپ کو بری کرانے کے لئے اس کی زبان پر چند الفاظ جاری کر دیئے۔ کسی کے پوچھے بغیر اس نے مجسٹریٹ سے کہہ دیا۔

"بشیر کو زہر میں نے دیا تھا۔"

اس کی آنکھیں پھر بند ہو رہی تھیں۔ مجسٹریٹ نے جلدی سے پوچھا

"اور تمہیں کس نے زہر دیا۔"

وہ صرف اتنا کہہ سکی۔ "ڈاک سے۔"

اور اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔"

میں نے خان بہادر سے دریافت کیا۔

"مجسٹریٹ اور آپ "ڈاک سے" کیا مطلب سمجھے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا۔

"غالباً وہ کہتی تھی کہ ڈاک کے ذریعہ کسی نے کوئی مٹھائی بھیجی جس میں زہر تھا۔ نرس نے وہ کھا لیا۔ جو اس کی ہلاکت کا باعث ہوا۔ پولیس نے ڈاک خانہ والوں سے دریافت کیا ہے کہ وہ پارسل کہاں سے آیا تھا۔"

میں نے پھر پوچھا۔

"اس کے نوکر کا کیا بیان ہے؟"

خان بہادر نے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا۔

"وہ ایک اور ہی کہانی سناتا ہے؟"

میں نے اصرار کے لہجہ میں استفسار کیا۔

"وہ کیسی کہانی بیان کرتا ہے؟"

خان بہادر نے کچھ بیزاری سی ظاہر کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"اس کا بیان ہے کہ کل نرس ہسپتال کے مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے گھر آگئی تھی۔ اور گھر آتے ہی پھر باہر چلی گئی۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں گئی جب واپس گھر آئی تو نوکر بازار گیا ہوا تھا۔ نوکر بازار سے واپس آیا اور اس نے نرس کے لئے کھانا اتارا تو کھانے میں ایک پلیٹ حلوے کی بھی تھی جو نوکر نے تیار نہیں کیا تھا۔ نوکر کے دریافت کرنے پر نرس نے بتایا کہ وہ حلوا کسی نے بھیجا ہے۔ نوکر نے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اُسے قطعاً علم نہیں کہ وہ حلوا کون دے گیا تھا۔ اس نے کسی کو مکان میں آتے نہیں دیکھا۔ ستم یہ ہے کہ نرس نے وہ سارا حلوا کھا لیا۔ اگر کچھ باقی بچا ہوتا تو اس کا کیمیائی امتحان کر کے نوکر کے بیان کی تصدیق کر لی جاتی۔ اب بھی اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہو گیا ہے۔ بہت جلد پتہ چل جائیگا کہ اسے کس قسم کا زہر دیا گیا ہے۔"

میں نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ بیان صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ تو ڈاک کے ذریعہ زہریلی مٹھائی وصول ہونے کا خیال ایک افسانہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اور ڈاک کے ذریعہ زہریلی مٹھائی آنے کے متعلق بیان خود نرس کا ہے۔ اگر نوکر اور نرس کے بیان میں ربط پیدا کیا جا سکے تو پولیس کسی نتیجہ پر پہنچ سکتی ہے۔ ایک اور بات بھی ہے۔ زہریلی مٹھائی اور زہریلے حلوا میں کیمیائی امتحان سے کیسے تمیز ہو سکتی ہے؟ کیمیائی امتحان صرف یہ بتا دیگا کہ نرس کی موت زہر کی وجہ سے ہوئی یا نہیں۔ اگر زہر کی وجہ سے ہوئی تو وہ کس قسم کا تھا۔ اس سے زیادہ گہرائی میں جا سکنا ڈاکٹروں کے بس کا روگ نہیں۔"

خان بہادر نے اس موضوع پر گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا۔

"بہر حال پولیس ڈاکخانہ سے تحقیقات کر رہی ہے کہ اگر نرس کو کوئی پارسل موصول ہوا تو وہ کہاں سے آیا۔ مجھے اس سے سروکار نہیں کہ نوکر کا بیان صحیح ہے یا نرس کا۔ تم بچ گئے۔ میں مطمئن ہوں۔ اگر یہ واقعہ در پیش نہ آتا تو تمہارا قید ہو جانا یقینی تھا۔"

مجھے یوں محسوس ہوا کہ خان بہادر بوڑھے ہوتے ہوئے بھی ابھی بچہ ہیں۔ انہیں میری تربیّت کی ضرورت ہے۔ وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے پھر بھی میں نے کچھ کہہ ہی دیا۔

"جہاں تک میری بہبودی آپ کے پیش نظر ہے۔ میں آپ کا بیحد ممنون ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں آپ کے احسان کا بدلہ کیسے ادا کر سکوں گا لیکن نرس کی ہلاکت پر آپ نے جس انداز سے اظہار رائے کیا ہے اس

سے مجھے خود غرضی کی بُو آتی ہے بحیثیت انسان کے مجھ میں اور نرس میں کیا فرق تھا؟ ایک کے مرنے سے دوسرا بچ گیا۔ اس میں اطمینان کی کونسی بات ہے۔ اس کی جان اتنی ہی قیمتی تھی۔ جتنی میری قیمتی جان ہے"

خان بہادر نے حیرت سے اپنی نظریں میرے چہرہ پر گاڑتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔ مگر خاموش رہے۔ پھر انہوں نے داروغۂ جیل سے ہاتھ ملایا اور یہ کہتے ہوئے جلدی سے باہر نکل گئے۔ کہ کل مجھے رہا کر دیا جائے گا۔ مجھے ایک خیال سوجھا اور میں ان کے پیچھے بھاگا۔ ابھی وہ چند ہی قدم گئے تھے کہ میں نے انہیں دوبارہ جا لیا۔

"آپ کو پتہ ہے میری ملازمت چھن چکی ہے۔ مجھے ہسپتال کے کوارٹر میں نہیں رہنے دیا جائیگا۔ دوسری کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں میں فوراً پناہ لے سکوں۔ جہاں آپ نے اتنے احسانات کئے ہیں۔ وہاں مجھے یہاں سے رہا ہونے کے بعد آپ صرف چند دن کے لیے اپنے ہاں ٹھہرنے دیجئے۔ میں اپنی رہائش کا بندوبست جلدی کر لوں گا۔"

خان بہادر نے صرف اتنا کہا۔

"تم آسکتے ہو۔"

اور پھر تیزی سے چلدئے۔ میں واپس آگیا۔ داروغۂ جیل نے مجھے کوٹھڑی میں دوبارہ بند کر دیا۔

جیل کی کوٹھڑی میں بیٹھ کر میں نے نرس کے بیان پر غور کرنا شروع کیا۔ اس کا اپنے متعلق بیان بظاہر ادھورا اور بے معنی تھا۔ لیکن میرے

نزدیک وہ اتنا مکمل اور بامعنی تھا کہ فوراً وہ میرے دل و دماغ پر چھا گیا۔ جو انسان پوری طرح موت کے پنجہ میں آچکا ہو۔ جس کا دم دمِ واپسیں ہو اس سے روانی بیان یا فصاحت کی توقع نہیں ہو سکتی ۔ نرس نے صاف کہہ دیا تھا کہ اسے ڈاکٹر ثریّا نے زہر دیا۔ موت اس کی زبان پر اپنی مہر ثبت کر رہی تھی۔ وہ صرف لفظ ڈاکٹر کو 'ڈاک' اور ثریّا کو 'سے' سے ادا کر سکی۔ ان عقلمندوں کی دانائی پر داد دینے کو بے اختیار جی چاہا۔ جنہوں نے ڈاک خانہ کے ریکارڈ دیکھنے شروع کر دیئے کہ زہریلی مٹھائی نرس کو کہاں سے موصول ہوئی۔

اب معاملہ صاف ظاہر تھا۔ مجھے نرس نے زہر دیا اور نرس کو ڈاکٹر ثریّا نے۔ اس سے میری یہ رائے غلط ثابت ہوئی کہ ڈاکٹر ثریا نے مجھے زہر دیا تھا۔ میری طبیعت میں بہت بڑا انقلاب ہو چکا تھا۔ مجھے اب ثریا سے نہ محبّت تھی نہ دشمنی۔ میں نے بڑے سکون کے ساتھ بالکل غیر جانبدار ہو کر اس بات پر غور کیا کہ ڈاکٹر ثریا نے نرس کو زہر کیوں دیا۔ کیا اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ نرس نے مجھے زہر دیا۔ اور اس نے نرس سے بدلہ لینے کی خاطر ایسا کیا۔ اگر صورتِ حال یہی ہو تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ثریّا کو ابھی تک مجھ سے محبت ہے۔ پھر خیال آیا کہ محبت تو بڑی چیز ہے۔ اگر اسے مجھ سے ہمدردی بھی ہوتی۔ تو وہ مجھے ملازمت سے علیحدہ کروانے میں سپرنٹنڈنٹ کی ہمنوا نہ بنتی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو وہ مجھے بھوکا مارنے کی کوشش کرے۔ اور دوسری طرف جب کوئی میری زندگی کا خاتمہ کرنا

چاہے تو اسے زہر دے دے۔ یہ بے معنی سی بات ہے۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ نرس نے مجھے زہر کیوں دیا؟ ہسپتال میں میری مختصر دفتری زندگی کے دوران میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جس سے نرس کو مجھ سے کوئی ناراضگی ہو سکتی۔ پھر نرس نے مجھے زہر کیوں دیا؟ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ نرس کا اپنا بیان موجود ہے۔ کہ اس نے مجھے زہر دیا اور اسے ڈاکٹر ثریا نے ٹھکانے لگایا۔ جب تک واقعات ہی سے آگے تک میری راہنمائی نہ کریں مجھے کوئی حق نہیں کہ میں یونہی بعض باتیں اپنے ذہن میں فرض کر کے ان سے نتیجہ نکالتا پھروں۔ میں نے اپنے دل سے کہہ دیا۔ کہ ڈاکٹر ثریا اور نرس دونوں کے فعل یقیناً قابل نفرت ہیں۔ لیکن یہ رائے قائم کرنے کے لیے کہ ان کی اس مذموم حرکت کی اصل وجہ کیا تھی۔ مجھے آئندہ واقعات کا انتظار کرنا چاہیے ممکن ہے کبھی کوئی ثبوت ہاتھ آ جائے۔

ایک ملاقاتی

دوسرے دن میں صبح ہی سے اس انتظار میں تھا کہ مجسٹریٹ کا حکمنامہ داروغہ جیل کے پاس پہنچے اور مجھے رہائی نصیب ہو۔ خدا خدا کر کے کہیں گیارہ بجے میرے قفس کا در کھلا۔ اور پرواز کا اذن ملا۔ میرا ذہن بالکل خالی

تھا مستقبل کے متعلق میں نے کچھ نہیں سوچا تھا جیل سے نکل کر میں سڑک پر ہو لیا ۔ جیل شہر سے کوئی میل بھر فاصلہ پر تھی ۔ صرف یہی سڑک جیل کو شہر سے ملاتی تھی ۔ اس پر دو رویہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر آم کے درخت تھے ۔ جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں ۔ یہ جون کی ۲۹ تاریخ تھی ۔ اور گرمی پورے شباب پر تھی ۔ زمین قبل از دوپہر ہی تانبے کی طرح تپ رہی تھی لو کے تھپیڑے پوری طرح شروع نہیں ہوئے تھے ۔ ادھر ادھر شاذ و نادر فضا میں تتلیاں اڑتی دکھائی دیتی تھیں ۔ مجھے صرف اتنا خیال تھا کہ میں سیدھا خان بہادر کے بنگلہ پر جاؤں گا اور بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا تھا ۔ میں جیل سے مشکل دو گز ہی پہنچا تھا کہ ایک آم کے گھنیرے درخت تلے عورت سے ملتی جلتی کوئی چیز گہرے نیلے رنگ کے برقع میں ملفوف دکھائی دی ۔ میں نے قدم تیز کر دیا ۔ اس کی وجہ مجھے معلوم نہیں ۔ صرف اتنا جانتا ہوں ۔ کہ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا ۔ میں برقع پوش خاتون کے قریب سے آگے نکل چکا تھا ۔ کہ برقع میں سے ایک نہایت شیریں مگر لرزتی ہوئی آواز آئی ۔

"مسٹر بشیر!"

ایک عورت کے منہ سے اپنا نام سن کر میں سر سے پاؤں تک لرز گیا ۔ میرے جسم کے رونگٹیں رونگٹیں سے نفرت اور حقارت کے شعلے نکلنے لگے ۔ آنکھوں میں خون اتر آیا ۔ اور ہاتھ بے قابو ہو رہے تھے ۔ کہ اتفاق سے ایک عورت اور وہ بھی تنہائی میں دوچار ہوئی ہے ۔ اس کا گلا

گھونٹ دوں۔ چند لمحوں کے لئے مجھے یوں محسوس ہوا کہ عورتوں کے ستائے ہوئے مردوں کی مظلومی اور جذبۂ انتقام مجھ میں یکجا ہو گیا ہے۔ اور تمام عورتیں یکسر سمٹ کر برقع کے نقاب میں آ چھپی ہیں۔ اگر میں اس عورت کا کام تمام کر دوں۔ تو گویا تمام مردوں نے تمام عورتوں سے بدلہ لے لیا

میں نے خدا سے جو عہد کیا تھا۔ اس وقت وہ مجھے بھول چکا تھا۔ میری خودکشی میرے ذہن سے اتر چکی تھی۔ میں اس وقت پھر وہی پہلا فرد انسان تھا۔ میں سر سے لے کر پاؤں تک مجسم قہر بن رہا تھا۔ مجھے اس کی بھی پروا نہ تھی۔ کہ برقع پوش خاتون کون ہے۔ اس کی زبان سے اپنا نام سن کر میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے بھی زیادہ کچھ نہ کہا۔ یکایک میں اس کی طرف بڑھا۔ کہ دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لوں۔ اتنے میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ خیالات کی ایک رو میرے دماغ میں آئی۔ جس نے میرے قہر اور غصہ کو مغلوب کر دیا۔ میرا اٹھا ہوا ہاتھ بے جان ہو کر اپنی جگہ پر گر گیا۔ انتہائی ندامت سے میری گردن جھک گئی۔ مجھے یاد آگیا کہ جس بشیر کو غصہ آنا چاہئے تھا۔ اسے میں نے جیل کی کوٹھڑی میں اپنے ہاتھوں دفن کر دیا تھا۔ میں جیل کی کوٹھڑی میں ابھی کل پیدا ہوا ہوں اس وقت میری عمر صرف دو دن کی ہے۔ مجھے آج تک کسی عورت سے سابقہ نہیں پڑا۔ میں کیا جانوں۔ عورتیں نیک ہیں یا بد۔ دوسرے لوگوں کے حالات سے کسی کے متعلق میرا رائے قائم کرنا کوئی عقلمندی نہیں۔ مرنے والے بشیر اور اس کے راستہ میں آنے والی عورتوں کا

مجھ پر اثر کیوں ہو۔ میں اپنی رائے قائم کرنے میں جلد بازی سے کیوں کام لوں۔ میں ایک ہی لمحہ میں یکسر بدل گیا۔ حیا سے میری آنکھیں جھک گئیں۔ اور میرا دل الٹا دھڑکنے لگا ہو۔ میں اس خاتون کے قریب آیا اور کہا۔

"محترمہ! آپ کو کچھ مجھ سے ارشاد کرنا ہے؟"

خاتون کے چہرہ سے نقاب اٹھ چکی تھی۔ میں نے انتہائی تعظیم سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا کوئی حسن۔ متناسب اعضاء اور معصومیت کے جادو سے انسانی ہوش و حواس کے لئے پیغام موت بن رہا تھا۔ لیکن میں اب اپنے آپ پر پورا قابو پا چکا تھا۔ رعب حسن مجھ پر رعشہ طاری کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ بلکہ میری اجلی روح اس ناقابل تسخیر حسن پر چھا چکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ خاتون کا چہرہ زرد ہو رہا ہے ماتھا پسینہ سے بھیگ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں زمین پر گڑی ہیں۔ اور وہ عجیب کشمکش سے دوچار ہے مجھے محسوس ہوا کہ اس نے مجھ سے پہلے بشیر کو دیکھا ہے۔ اور وہ سہم گئی ہے۔ چند لمحے پیشتر میں درندگی اور خونریزی کی علامتیں میرے چہرہ سے عیاں تھیں۔ اس نے خاتون پر کپکپی طاری کر دی ہے۔ وہ میرے سامنے اس وقت تک محض اس لئے کھڑی ہے کہ اس کی ہمت جواب دے چکی ہے۔ ورنہ وہ کبھی کی بھاگ گئی ہوتی۔ میں نے چاہا کہ وہ اس بشیر کو بھول جائے اور اب مجھ سے مخاطب ہو میں نے پھر التجا آمیز نرمی سے کہا۔

"کہیئے محترمہ! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"
رفتہ رفتہ اس کے چہرہ پر سرخی آرہی تھی۔ بڑی کشمکش کے بعد اس نے کہا۔
"آپ کے پانچ ہزار روپے چھن گئے۔ میں وہ آپ کو واپس دینے آئی ہوں"
یہ کہہ کر اس نے برقع میں سے ایک چھوٹا سا ڈبہ نکال کر میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔
"بھیا اشرف میرے بڑے بھائی ہیں مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ وہ آپ سے پانچ ہزار روپیہ ٹھگ کر لے گئے تھے۔ میں وہ واپس کرنے آئی ہوں۔ اس ڈبہ میں میرے زیورات ہیں۔ ان کی مالیت پانچ ہزار سے زائد ہے میں درخواست کرتی ہوں کہ آپ انہیں لے کر فروخت کر لیجیئے"
میں "محترمہ! میرا دل آپ کی ہمدردی اور اس توجہ کا ممنون ہے۔ لیکن میں آپ کی یہ پیشکش قبول نہیں کر سکتا۔ میں آپ سے صاف عرض کیوں نہ کر دوں کہ کل سے میں نے اپنی گزشتہ زندگی بالکل بھلا دی ہے۔ میں کسی گذشتہ واقعہ کی یاد تازہ کرنی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے کن چیزوں کی آئندہ ضرورت ہوگی۔ اس کا مجھے علم نہیں۔ اگر آپ کے ان زیورات کا تعلق صرف ان دو دنوں کے کسی واقعہ سے ہوتا۔ تو میں ضرور انہیں لے لیتا۔ اس سے پہلے کے واقعات کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ اشرف کبھی میرا دوست تھا۔ ہوتا ہوگا۔ وہ مجھ سے پانچ ہزار روپیہ دھوکا دے

کر لے گیا۔ اس وقت مجھے اس سے کیا؟ میرے دل میں اس کے لیے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن میں نے کل اس نفرت کو پاؤں تلے مسل ڈالا۔ مجھے اشرف سے کوئی علاقہ نہیں۔ میں اسے نہیں جانتا۔ مجھے اس سے کچھ نہیں لینا۔ آپ کا شکریہ!"

خاتون:" میں آپ کے سارے حالات جانتی ہوں۔ مجھے بعض ایسی باتوں کا بھی پتہ ہے۔ جو آپ کو معلوم نہیں۔ اتنی مصیبتیں جھیلنے اور کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جانے پر بھی روپیہ کو اتنا حقیر سمجھنا میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ آپ یقیناً فرشتہ ہیں۔ انسان نہیں۔ میں نے اندازہ کیا تھا کہ آپ بہت شریف آدمی ہیں۔ میں نے آپ کو اس سے بڑھ کر پایا۔ لیکن میری اس پیشکش کو ٹھکرا کر آپ کیا کریں گے؟ آخر آپ کہاں سر چھپائیں گے۔ کیا کھائیں گے۔ کہاں سے اپنی ضروریات پوری کریں گے؟"

میں:" مجھے اس کا کچھ پتہ نہیں۔"

خاتون:" کیا آپ کو واقعی بھیا اشرف سے نفرت نہیں۔ ثریا سے تو آپ کو ضرور ہی نفرت ہو گی۔ آپ کی مصیبتوں کا زیادہ حصہ اسی کے منصوبوں کا نتیجہ ہے۔"

میں:" مجھے نہ اشرف سے نفرت ہے نہ ثریا سے۔ میں عرض کر چکا ہوں مجھے کسی سے کوئی علاقہ نہیں۔"

خاتون:" بھیا اشرف اپنے کیے کی سزا پا چکے ہیں۔ ثریا سزا پا رہی ہے اور شاید اس کی سزا جان لیوا ثابت ہو۔ اس نے آپ کو ہلاکت کے پنجہ

میں پھنسایا۔ مگر قسمت کی خوبی سے آپ بچ گئے۔ نرس پر حملہ ہوا۔ وہ جانبر نہ ہو سکی۔"

میں ثریا کا نام زبان پر لانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اس نام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نہ مجھے اس سے دشمنی تھی کہ اسے تکلیف میں سن کر مجھے خوشی ہوتی۔ پھر بھی زہر والی دونوں وارداتیں ابھی تک میرے لئے معمہ تھیں۔ انہیں حل کرنا ضروری تھا۔ میں نے ذرا بے تکلف ہو کر کہا۔

"ثریا نے نرس کو کیوں زہر دیا؟"

خاتون نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔

"اس لئے کہ نرس نے آپ کو زہر دیا تھا۔ اور ثریا کو آپ سے محبت ہے۔ وہ نرس سے بدلہ لینا چاہتی تھی۔ اس نے بدلہ لے لیا۔"

یا اللہ! کیا میں ثریا کے متعلق بدظنی سے کام لیتا رہا تھا؟ کیا مجھے زہر دینے میں ثریا کا ہاتھ نہ تھا۔ میں کیا سن رہا ہوں۔ اسے مجھ سے ابھی تک محبت ہے۔ شادی ہو جانے کے بعد وہ مجھے نہیں بھولی۔ آہ! آہ!!

میں پھر وہی پرانا بشیر بن رہا تھا۔ مجھ پر کمزوری غالب آرہی تھی۔ میں جلدی سے کچھ اور پوچھنے ہی والا تھا کہ میرے دل نے مجھے پھر ملامت کی۔ میں پھر اپنی اصلی نئی حالت پر آگیا۔ میں خاتون سے پھر مخاطب ہوا۔

"شاید آپ یہ بتا سکیں کہ نرس نے مجھے کیوں زہر دیا؟ میں یہ صرف اس لئے دریافت کر رہا ہوں۔ کہ اگر میری کسی کمزوری نے نرس کے دل

میں دشمنی پیدا کردی تھی۔ اور وہ کمزوری اب بھی مجھ میں موجود ہے تو اسے دُور کردوں۔"

خاتون:"نرس نے ثریا کے کہنے پر صراحی میں زہر ڈالا تھا۔ ثریا کو آپ سے نفرت تھی۔"

میں:"آپ کی گفتگو نے میرے معمّہ کو حل کرنے کی بجائے زیادہ پیچدار بنا دیا ہے۔ آپ سمجھتی ہیں کہ ثریا نے مجھے اس لئے زہر دلوایا کہ اُسے مجھ سے نفرت تھی۔ اور اس نے نرس کی جان میری محبت کی وجہ سے لی۔ کیا آپ کا یہی مطلب ہے؟ اگر یہی مطلب ہے تو میں اس کی تہ تک پہنچنے سے قاصر ہوں۔ آپ کو علم ہو تو مجھے بتائیے کہ اسے مجھ سے نفرت کیوں ہوئی ہے"

خاتون:"معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کو ہیڈ آفس سے ہسپتال میں تبدیل ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ثریا کو آپ ایک پراسرار شخصیت نظر آنے لگے۔ اس نے سمجھا کہ آپ محض تفریح کی خاطر ملازم ہیں۔ اور محض مصروف رہنے کے واسطے دفتر کی پابندی گوارہ کر رہے ہیں۔ اُسے آپ سے (خاتون نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا) محبت ہوگئی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ آپ سے شادی کرے گی۔ ادھر بھتیجا اشرف کو کسی طرح معلوم تھا کہ ثریا کے پاس ستر ہزار روپیہ ہے۔ انہوں نے ثریا سے دوستی بڑھانی چاہی۔ تاکہ وہ اُن سے شادی کر لے۔ لیکن ثریا نے توجہ نہ کی۔ جب آپ نے ثریا کو بتا دیا کہ آپ اس سے شادی نہیں کرسکتے اور یہاں

کی وجہ آپ کی اور ثریا کی پوزیشن کا یکساں نہ ہونا ہے۔ تو وہ بھیّا اشرف کی طرف ملتفت ہوگئی۔ اس نے بھیا سے نقد حق مہر چالیس ہزار روپیہ کا مطالبہ کیا۔ بھیا نے والد کے جعلی دستخط کرکے بینک سے چالیس ہزار روپیہ نکلوا لیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ چالیس ہزار روپیہ ثریا کے ستر ہزار کو کھینچ لائے گا اور پیشتر اس کے کہ والد کو اس جعل سازی کا پتہ چلے بھیّا چالیس ہزار روپیہ بینک میں دوبارہ جمع کرا چکے ہونگے۔ لیکن ثریا نے بھیّا سے چالیس ہزار روپیہ لے کر اپنے نام جمع کرا لیا۔ اور بھیّا ہاتھ ملتے رہ گئے۔ انہوں نے شادی والد کو اطلاع کئے بغیر ایک ہوٹل میں کر لی۔ بھیا کو پتہ تھا کہ والد انہیں اس وقت تک شادی کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ جب تک وہ خود روزی کمانا نہ سیکھ لیں۔ ان کی شادی کے ایک ہفتہ بعد والد کو روپے کی ضرورت پڑی۔ بینک والوں نے کہہ دیا کہ وہ اپنا سارا روپیہ نکلوا چکے ہیں۔ اس پر معاملہ پولیس کے سپرد ہوا اور بھیا روپوش ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ثریا پر منکشف ہو گیا کہ بھیّا نے جو سبز باغ دکھائے تھے۔ ان میں ذرہ بھر بھی حقیقت نہ تھی۔ اب وہ اپنی شادی پر پچھتائی۔ اتنے میں ادشا نے انجمن میں سول میرج کو رواج دینے کی قرارداد پیش کرکے منظور کروا لی اور جس جلسہ میں یہ قرارداد منظور ہوئی اسی میں ادشا نے اپنی تقریر میں آپ کا ذکر بار بار کیا۔ ثریا کو پہلے بھی شبہ تھا کہ آپ کو ادشا سے محبت ہے۔ اسی وجہ سے آپ نے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔
"میں نے ثریا سے شادی کرنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنے حالات بیان کر کے فیصلہ اسی پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ اگر کہہ دیتی کہ ان حالات کے باوجود میں اسے قبول ہوں تو میں اسی وقت اس سے شادی کرنے کو تیار تھا۔ میرے حالات سننے کے بعد وہ خود ہی خاموش ہو گئی اور بعد میں اس نے اشرف کے حق میں فیصلہ کر دیا۔"
میں نے اپنی اس گفتگو کے دوران میں خاتون کے چہرہ پر اضطراب کے آثار دیکھے۔ وہ اپنے نقاب کا ایک گوشہ ہاتھ میں لئے اسے مسل رہی تھی۔ اس نے پھر اپنی گفتگو جاری کی اور کہا۔
"بہر حال ثریا نے اپنے آپ کو ایک قومی کارکن ظاہر کر کے اوشا سے ملی۔ اور باتوں ہی باتوں میں آپ کا نام درمیان میں لے آئی۔ اوشا نے اسے بتایا کہ آپ کو اس سے بہت لگاؤ ہے۔ اور آپ اسے خوش کرنے کے لئے دیہات کے دورہ پر گئے ہیں۔ اوشا جوں جوں شوق سے آپ کا ذکر کرتی۔ ثریا جل بھن کر کباب ہوئی جا رہی تھی اسے یقین ہو گیا کہ آپ نے اسے دھوکا دیا ہے۔ اور آپ کے اسے بیوی نہ بنانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس نے بلا سوچے سمجھے ایک ایسے آدمی کو منتخب کر لیا۔ جو اس کی امیدیں پوری نہ کر سکا۔ بلکہ وہ سخت غیر ذمہ دار ثابت ہوا۔ ان باتوں نے ثریا کے دل میں آپ کے خلاف انتقام کی آگ بھڑکا دی۔ اور اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اوشا کو

بھی سہاگن نہ بننے دیگی۔ اس نے نرس کو اپنے راز میں لیا اور آپ کی صراحی میں زہر ڈلوا دیا۔ آپ کی عمر باقی تھی۔ صراحی میں پانی تھوڑا تھا۔ اور آپ نے اتنا زیادہ زہر پی لیا کہ آپ کا معدہ اسے برداشت نہ کر سکا۔ اور قے کے ذریعہ وہ باہر آ گیا۔ اس واقعہ کے بعد ایک شام رانی باغ میں ثریا کی ملاقات اتفاقیہ طور پر اوشا سے ہو گئی۔ اوشا نے ثریا کو بتایا کہ آپ کے اور اوشا کے درمیان شدید اختلاف رائے ہو چکا ہے۔ اور مدتوں آپ ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ اس پر ثریا کو بیحد صدمہ ہوا کہ اس نے محض ایک غلط فہمی کی بنا پر آپ کی جان لینے کی کوشش کی۔ اس کا دماغی توازن خراب ہونے لگا۔ اور خود وہ کچھ نہ کر سکی۔ اضطراری حالت میں اس نے نرس کو حلوے میں زہر ملا کر دیدیا۔ اس کی وجہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ صرف نرس ہی ثریا کی ہمراز بن سکتی تھی۔ اگر نرس موجود نہ ہوتی تو ثریا اور کسی کے ذریعہ آپ کو زہر نہ دے سکتی۔ اور خود اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ آپ کے کوارٹر تک رات کے وقت زہر لے کر جاتی۔ اس نے اپنی اس کارستانی کا ذمہ دار نرس کو ٹھہرا کر اسے پار کر دیا۔

ہم گفتگو میں ایک دوسرے سے کسی حد تک بے تکلف ہو چکے تھے میں نے بغیر اس کی طرف دیکھے کہا۔

"آپ اس طرح وثوق سے ہر بات کہہ رہی ہیں۔ جیسے آپ ثریا کی ہمزاد ہیں اور ہر وقت اس کے اس کے ساتھ تھیں۔"

میری مخاطبہ پر زحمت طاری ہو گئی اور اس نے پھر نقاب کا ایک سرا انگلیوں

بیں لے کر موڑنا شروع کر دیا۔ اس کی یہ کیفیت مجھ پر اثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ میں نے سوال کے الفاظ بدل کر اسے دہرایا۔

"آپ کو ان حالات کا علم کیسے ہوا؟"

خاتون کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کا سانس تیز ہو گیا۔ اور میں نے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلک دیکھی۔ میرے اصرار پر وہ رک رک کر صرف اتنا کہہ سکی۔

"ثریا بیمار ہے سخت بیمار۔ اس پر ہذیان کی حالت طاری ہے اُس نے یہ قصہ ہذیان میں کئی مرتبہ دہرایا ہے۔ واقعات کو ترتیب میں نے خود دیا ہے۔ لیکن یہ بیان اسی کا ہے۔"

میں "وہ کب سے بیمار ہے۔ اور اس وقت وہ کہاں ہے۔ کیا وہ کوہ اماوس سے واپس آچکی ہے؟"

خاتون۔" ثریا کوہ اماوس قطعاً نہیں گئی۔ بھیا اشرف نے ایک ہوٹل میں اس سے شادی کی اور وہیں دونوں ٹھہرے رہے۔ یہاں تک کہ بھیا روپوش ہو گئے۔ اشفاق سے رانی باغ والی ملاقات کے بعد سے ثریا کو بخار آنے لگا جس نے آخر انتہائی شدت اختیار کر لی۔ اب اگر اسے ایک گھنٹہ ہوش آتا تو چار گھنٹے وہ ہذیان میں آپ کا قصہ بیان کرتی رہتی ہے۔ میرے والد ایک مہینہ کیلئے باہر گئے ہوئے ہیں۔ میں باقی گھر والوں کو منا کر ثریا کو اپنے گھر لے آئی ہوں اس کا علاج ہو رہا ہے۔ مگر اس کا دوبارہ تندرست ہونا خدا ساز بات ہو چکی ہے۔"

میں خاتون کے الفاظ سن کر خاموش ہو گیا۔ میں انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔ خاتون قدرے بیباکی کے ساتھ نظریں میرے چہرہ پر گاڑھے اس میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے جب اس نے سمجھا کہ میں مزید کچھ نہیں کہوں گا۔ تو اس نے کہا۔

"ثریا نے جو کچھ کیا بُرا کیا۔ انسان ہے۔ آخر غلطی ہو ہی جاتی ہے۔"

میں خاموش تھا۔

اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"بیچاری ثریا۔ اب کوئی دم کی مہمان ہے۔ کاش اس کا علاج ہو سکتا۔"

میں نے دریافت کیا۔

"آپ ابھی ابھی کہہ رہی تھیں کہ اس کا باقاعدہ علاج ہو رہا ہے۔"

خاتون ۔" اس کا علاج یہی ہے کہ آپ کے متعلق جو بوجھ اس کے دل پر ہے وہ دور ہو جائے۔"

اس نے استفہامیہ نگاہ سے میری طرف دیکھا۔

میں ۔" میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ آپ در اصل کیا چاہتی ہیں"

خاتون ۔" میں ——— میں ——— یعنی ثریا آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ کیا آپ اس کی آخری درخواست قبول نہیں کریں گے؟"

میں ۔" محترمہ! آپ کی ہمدردطبیعت کی میرے دل میں بڑی قدر

ہے۔ میں کئی بار دہرا چکا ہوں کہ ثریا سے مجھے دشمنی نہیں۔ اس کی جان بچانا تو بڑی بات ہے۔ اگر میرے اس کے سامنے جانے سے اسے تھوڑا سا بھی فائدہ پہنچ سکے۔ تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ میں ہر انسان کا خیر خواہ ہوں۔ یہ ثریا پر ہی منحصر نہیں۔ میں ہر انسان کی خدمت کرنے کو تیار رہوں۔ لیکن محترمہ! میں نہیں چاہتا کہ میرے ماضی کو میرے حال سے کوئی بھی واسطہ ہو۔ ثریا کے سامنے جانے سے نہ صرف میرے ماضی اور حال میں سلسلہ قائم ہو جائے گا۔ بلکہ اس کا احساس ندامت کسی نہ کسی طرح اُسے مستقبل سے بھی منسلک کرنے کی کوشش کرے گا۔ آپ خود کہہ رہی ہیں کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔ میرے وہاں جانے سے وہ اور بھی پختہ ہو جائیگی۔ کیا آپ ذمہ لیتی ہیں کہ ثریا آج کے بعد سمجھنے لگی کہ میں گویا دنیا میں موجود نہیں ؟ اس حقیقت پر غور کر کے ارشاد فرمایئے۔"

خاتون شش و پنج میں تھی۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ طویل سکوت کے بعد وہ بولی۔

"یہ ممکن نہیں۔ وہ آپ کو نہیں بھولے گی۔ آپ عورت کی فطرت سے واقف نہیں۔"

میں۔" میں مجبور ہوں میں وہاں نہیں جا سکتا۔ آخر وہ کہنا کیا چاہتی ہے ؟"

خاتون۔" وہ تو یہ چاہتی ہے کہ آپ اُسے معاف کر دیں۔"

میں "بس یہی؟"

خاتون "ہاں۔ یہی۔"

میں "آپ اُسے جاکر کہہ دیں۔ میں نے اُسے معاف کر دیا۔"

خاتون نے حیرانی سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجئے۔ میں سمجھتی ہوں کہ میں حد سے بڑھ رہی ہوں۔ مگر آپ کے چہرہ سے میں آپ کے دل کا حال نہیں پڑھ سکتی۔ کیا آپ کا یہ مطلب ہو کہ آپ اس ثریا کو نہ دل سے معاف کر رہے ہیں۔ جس نے دو خون کئے۔ اور آپ کی زندگی جہنم سے بدتر بنا دی۔ کیا آپ محض مجھے ٹالنے کی غرض سے یہ کہہ رہے ہیں۔ یا در اصل یہ الفاظ آپ کے دل سے نکل رہے ہیں۔"

میں "خاتون! یہ الفاظ میرے دل سے نکل رہے ہیں۔ میں ریاکار نہیں جو کچھ میرے دل میں ہے۔ وہی زبان پر ہے۔ میں نے ثریا کو اس کے گناہ کا وہ حصہ معاف کر دیا۔ جو مجھ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور جسے میں معاف کر سکتا ہوں۔ گناہوں کو معاف کرنا خدا کا کام ہے۔ ثریا سے کہئے۔ وہ خدا سے اپنے گناہ بخشوائے۔ بہر حال میں نے اُسے معاف کیا۔"

خاتون گلوگیر ہو کر بولی۔

"آپ کتنے اچھے ہیں۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلک پھر دیکھی اور منہ ارادتاً دوسری طرف کر لیا۔

وہ پھر گویا ہوئی۔

"میں ثریا سے کہہ دوں گی کہ آپ نے اسے معاف کر دیا۔ لیکن اسے یقین نہیں آئے گا۔ اور میں آپ کو یہ مشورہ بھی نہیں دے سکتی کہ آپ اس سے ضرور ملیں اگر آپ کاغذ کے ایک پرزہ پر صرف دو سطریں اپنے ہاتھ سے لکھ دیں تو اسے یقین آجائے گا۔ اسے اس بات کا یقین آنا ضروری ہے کہ آپ نے اسے معاف کر دیا۔"

میرے پاس نہ کاغذ تھا نہ پنسل۔ نہ خاتون کے پاس ہی لکھنے کا سامان تھا۔ آخر یہ طے ہوا کہ اس کا نوکر خان بہادر کے بنگلہ پر میرے پاس آجائے میں اسے دو سطریں لکھ دوں گا۔"

ملاقات ختم تھی۔ کم از کم مجھے خاتون سے کچھ نہیں پوچھنا تھا۔ میں نے اتنی گرمی میں تکلیف اٹھا کر اس کا مجھ سے ملنے آنے پر شکریہ ادا کیا۔ اور پھر چلنے لگا۔ خاتون نے میرا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

"میرا پروگرام آپ سے باتیں کرنا نہ تھا۔ میں آپ کا روپیہ واپس دینے آئی تھی۔ میں بھتیا اشرف کی بہن ہوں۔ بہن اور بھائی میں فرق نہیں ہوتا۔ آپ اپنا روپیہ ان زیوروں کی صورت میں واپس لے لیں۔ میں صرف یہ زیور آپ کو دینے آئی تھی۔ کیا آپ میرے والد کی وہ زیادتی معاف نہ کریں گے۔ جو انہوں نے اس روز آپ سے کی جب آپ بھتیا کی تلاش میں ہمارے ہاں آئے تھے۔ میں نے والد کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ میں قریب ہی کے کمرہ میں موجود تھی۔ نوکر جب بندوق لے کر

باہر آیا۔ میں نے اس میں سے گولیاں نکال لی تھیں۔ اگر والد آپ کو مارنا بھی چاہتے تو نہ مار سکتے۔ میں مجبور تھی۔ ایک غیر آدمی کی موجودگی میں آگے بڑھ کر والد کو روکنا میرے بس کی بات نہ تھی۔"

میں :" آپ ناراض نہ ہوں تو میں ایک بات پوچھتا ہوں۔ فرض کرو کہ میں یہاں کھڑا ہوں۔ اور آپ کسی طرف سے ادھر آنکلیں۔ اور میرے قریب سے گزریں۔ تو میں آپ کو پانچہزار روپیہ پیش کرنے کی کوشش کروں۔ تو آپ اسے قبول کر لیں گی؟"

خاتون :" ہرگز نہیں۔ کسی کو ایسی جرأت ہی کیوں ہونے لگی۔"

میں :" تو میں آپ کا زیور کیسے لے سکتا ہوں۔ جو بات آپ اپنے لئے پسند نہیں کرتیں۔ وہ آپ کو دوسروں کے لئے بھی گوارہ نہیں ہونی چاہئیں۔"

خاتون :" یہ بات نہیں۔ ایک تو آپ کا روپیہ میرے بھائی کے ذمہ ہے۔ دوسرے یہاں روپیہ دینے والی لڑکی ہے اور روپیہ لینے والا مرد۔ اس لئے آپ کی وہ مثال یہاں صادق نہیں آتی۔"

میں :" جو بات عورت کے لئے ناپسندیدہ ہے وہ مرد کے لئے بھی زیبا نہیں۔"

خاتون نے بہت اصرار کیا۔ لیکن میں نے اس کی پیش کش قبول نہ کی۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا۔ کہ اس کا نام شیریں ہے۔ امسال اس نے کوئین میری کالج سے بی۔ اے کا امتحان دیا ہے اور یہ

کہ وہ اپنے زیورات اپنے والدین سے چوری لائی تھی۔ اس کا والد مہینہ بھر کے لیئے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ والدہ کی نظر سے بچا کر وہ اپنے زیورات کا ڈبہ اٹھا لائی۔

قسمت کا فیصلہ

خان بہادر نے چند دن کے لیئے میرے واسطے اپنے بنگلہ میں ایک کمرہ خالی کروا دیا تھا۔ میرے بنگلہ میں داخل ہوتے ہی نوکر مجھے اس کمرہ میں لے گیا۔ اور کہنے لگا کہ جس چیز کی ضرورت ہو۔ میں اُسے بتا دیا کروں۔ خان بہادر سارا دن عدالت میں مصروف رہتے تھے۔ مگر آج اتفاقیہ طور پر وہ جلدی آ گئے۔ اور آرام کرنے سے پہلے وہ میرے کمرہ میں تشریف لائے۔ اور بزرگانہ رنگ میں مجھے تسلی دی۔ پھر وہ یکایک خلاف توقع کرسی پر بیٹھ کر بولے۔

"بشیر! تم فوراً شادی کر لو۔ شادی کہاں اور کیسے کرو؟ یہ میں نہیں جانتا۔ اپنی برادری پر نگاہ ڈالو۔ اور کسی جگہ رشتہ پکا کر لو تمہاری ننانوے فی صدی پریشانیاں صرف شادی کر لینے سے دُور ہو جائینگی۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔ شادی کر لو۔ خدا رازق ہے۔ وہ رزق کا بندوبست خود کر دے گا۔"

خان بہادر یہ کہہ کر اٹھے اور چلے گئے۔ میں سوچنے لگا کہ خان بہادر کو یہ کیا سوجھی۔ میں ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہوں۔ سر چھپانے کو جگہ نہیں۔ ملازمت سے علیحدہ ہو چکا ہوں۔ نان و نفقہ کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ اور آپ ہیں کہ شادی کی تلقین فرما رہے ہیں۔ شادی کا خرچ اور بیوی کے مصارف کہاں سے آئیں گے۔

تھوڑی دیر بعد شیریں کا نوکر آیا۔ میں نے کاغذ قلم لیا اور سوچنے لگا کہ کیا لکھنا چاہیئے۔ رہ رہ کر شیریں کا چہرہ نظروں کے سامنے آنے لگا۔ کاغذ میرے سامنے تھا اور قلم ہاتھ میں۔ دس منٹ بیٹھا سوچتا رہا۔ لکھ ایک لفظ بھی نہ سکا۔ میں نے اپنی آنکھیں ملیں اور جلدی سے لکھ دیا

محترمہ ڈاکٹر ثریا

آپ کی وجہ سے مجھے جو تکلیف پہنچی۔ وہ آپ کو معاف کرتا ہوں میری خواہش ہے کہ آپ زندہ رہیں اور خوش خوش زندگی بسر کریں۔

بشیر

میں نے کاغذ کا پرزہ تہ کیا اور لفافہ میں ڈال کر اپنے سامنے رکھ لیا میں ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اس خط کے متعلق نہیں۔ شیریں کے متعلق۔ شیریں کا نوکر بدستور کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے دوبارہ قلم اٹھایا اور ایک خط لکھ دیا۔ یہ دوسرا خط میں نے کب لکھنا شروع کیا اور کب اسے ختم کیا۔ اس کا مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ کوئی غیبی طاقت تھی کہ میرے ہاتھ میں قلم دے کر اسے کاغذ پر اپنی مرضی کے مطابق

کچھ لکھاتی جا رہی تھی۔ میں پوری طرح ہوش میں آیا۔ تو سامنے لکھا پڑا تھا۔

محترمہ شیریں

آپ میرے حالات سے واقف ہیں۔ بلکہ آپ کے اپنے الفاظ کے مطابق میرے متعلق آپ کو ان باتوں کا بھی علم ہے جس کا مجھے پتہ نہیں۔ میں نے آپ سے صرف ایک مرتبہ گفتگو کی ہے۔ اس سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میں اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ایک ایسے شخص سے ملا ہوں جس کا دل خودغرضی سے پاک اور انسانی ہمدردی سے لبریز ہے۔ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔ میں جائز صورت میں اس کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں آپ سے شادی کے لئے درخواست کرتا ہوں۔ آپ میری اس درخواست پر پوری طرح غور فرمائیں میرے موجودہ حالات کے ہوتے ہوئے اگر آپ نے آپ کو میری زندگی بھر کی رفاقت پر آمادہ کر سکیں تو میں اسے اپنی خوش قسمتی کی دلیل سمجھونگا۔ لیکن اگر آپ انکار کر دیں اس سے تو مجھے افسوس نہ ہوگا۔ میں سمجھ لوں گا کہ میں آپ کا اہل نہ تھا۔ کہ میری درخواست سے آپ کو اتفاق ہو تو اطلاع دیں تا باقاعدہ سلسلہ جنبانی کی صورت پیدا کی جائے۔ جو ظاہراً حالات کے لحاظ سے ابھی تک ناممکن نظر آتی ہے۔ اگر آپ اس درخواست

کو پسند نہ فرمائیں تو مجھے اطلاع دینے کی ضرورت نہیں ہیں
دو دن تک آپ کی طرف سے جواب نہ آنے کی صورت میں مطلب
سمجھ جاؤں گا۔

بشیر

میں نے یہ خط اور ثریا والا خط دونوں ایک ہی لفافہ میں ڈالے۔ لفافہ بند کر کے شیریں کا پتہ لکھا اور اس کے نوکر کے سپرد کر دیا۔ دو دن تک شیریں کی طرف سے مجھے کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اس نے میری بیوی بننا پسند نہیں کیا۔ میں نے غیر جانبدار ہو کر اپنے حالات کا جائزہ لیا۔ اور اپنے دل میں کہا کہ شیریں بڑے باپ کی بڑی بیٹی ہے اپنے بھائی کے برعکس طبیعت حد درجہ سعادت مند پائی ہے۔ اس پر وہ اعلیٰ تعلیم سے بھی مستفیض ہے اور میں ہوں کہ سوائے بی اے کی ڈگری اور بد قسمتی کی چند داستانوں کے میری زندگی کا سرمایہ کچھ نہیں شیریں کا خاموش رہنا ایک قدرتی بات تھی۔

دو دن کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ اب شیریں مجھے خط نہیں لکھے گی پھر بھی دل میں امید کی جھلک موجود تھی۔ تیسرے دن امید کی وہ جھلک بھی رخصت ہوئی اور میں نے اس معاملہ پر غور کرنا ہی چھوڑ دیا چوتھے دن چٹھی رساں میرے نام ایک رجسٹرڈ لفافہ لایا۔ میں نے رسید پر دستخط کر کے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ طرزِ تحریر غیر مانوس معلوم ہوئی چٹھی رساں کے چلے جانے کے بعد میں نے لفافہ چاک کیا۔ میری

حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس میں پانچہزار روپے کے نوٹ ملفوف تھے۔ ان کے ساتھ کاغذ کا ایک ٹکڑا پن سے منسلک تھا۔ پرزہ پر صرف یہ حرف رقم تھے۔

"آپ کی ہونے والی بیوی شیریں کی طرف سے ناچیز تحفہ!"

میرے کمرہ کا طول و عرض کم ہی تھا۔ مگر میں نے اٹھ کر جلدی جلدی ٹہلنا شروع کر دیا۔ کبھی نوٹوں کا بنڈل اٹھاتا۔ کبھی شیریں کا یہ پہلا نامۂ محبت پڑھتا اور کبھی خالی لفافہ کو دیکھتا۔ لفافہ کو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ محض رجسٹرڈ خط نہ تھا بلکہ پانچہزار کا بیمہ تھا۔ بہر حال میں نے کئی پہلوؤں سے اس معاملہ پر غور کیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ خان بہادر سے یہ سارا معاملہ عرض کر دینا چاہیئے۔ اس وقت خان بہادر عدالت میں تھے۔ میں بڑی بے تابی سے ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ ایک ایک لمحہ سال سال کے برابر گزر رہا تھا۔

شام کو خان بہادر اپنے مطالعہ کے کمرہ میں داخل ہوئے ہی تھے کہ شیریں کا لفافہ نوٹوں سمیت ہاتھ میں لئے ہوئے میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ شروع سے لے کر آخر تک میں نے ان سے سب سرگزشت کہدی اور ان سے رہنمائی اور سرپرستی کے لئے درخواست کی۔

میں نے خان بہادر سے کوئی بات پوشیدہ رکھنی مناسب نہ سمجھی اور ہر راز ان سے کہہ دیا۔ اپنی نئی زندگی کے دور میں ہر اکوئی سازش کرنا یا اپنے دل اور زبان میں مطابقت نہ رکھنا ناممکن تھا۔ خان بہادر تو میرے

محسن تھے۔ کوئی عام آدمی بھی چوچا بنا پوچھ سکتا تھا۔ سب کچھ عرض کر دینے کے بعد میں نے خان بہادر سے مشورہ طلب کیا کہ مجھے شیریں کا پانچ ہزار روپیہ قبول کر لینا چاہیئے یا اسے واپس لوٹا دوں خان بہادر نے عینک اُتار کر اپنی آنکھوں کو رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے ہمیشہ یقین تھا کہ تم کسی نہ کسی دن ضرور کوئی کارنمایاں کرو گے تمہارا کلرک بننا مجھے پسند نہ تھا۔ صحیح فطرت اپنے جوہر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ تمہیں اپنے ارادہ میں ضرور کامیابی ہوگی میں بوڑھا ہوں۔ خدا کا دیا میرے پاس سب کچھ ہے۔ میں محض اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے بیرسٹری کرتا ہوں۔ ورنہ اب میرا وہ وقت ہے جب مجھے تنہائی میں بیٹھ کر موت کا انتظار کرنا چاہیئے۔ مجھے یہ خواہش کبھی نہیں ہوئی کہ میں زیادہ دیر زندہ رہوں۔ لیکن اب میں چاہتا ہوں۔ کہ تھوڑی دیر اور جیئوں تاکہ تمہیں کامیاب دیکھ سکوں۔ جیسا کہ تم دیکھتے ہو میرا یہ مکان بڑا وسیع ہے۔ میں اس کا ایک حصہ تمہارے لئے خالی کرا دیتا ہوں۔ آپ یہاں اپنا دفتر بنا لیں اور اپنی دیہاتی تنظیم کو ایک انجمن کی صورت دے دیں۔ اسمبلی کے انتخاب میں چار پانچ ماہ کا عرصہ باقی ہے۔ تمہیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ جن لوگوں سے تمہارا مقابلہ ہوگا وہ سرمایہ دار ہیں۔ سیاسیات کا انہیں تجربہ ہے۔ وہ اس وقت برسر اقتدار ہیں اور اپنے اختیارات کو انتخاب میں ضرور استعمال کریں گے۔ وہ حاکموں کے ذریعہ دیہاتی لوگوں کو مرعوب کر کے ووٹ اپنے حق میں

ڈلوانے کے لئے پورا زور لگائیں گے۔ تمہیں بہت سوچ سمجھ کر ہر قدم اٹھانا ہوگا۔ شیریں تم سے منسوب ہو چکی ہے۔ تم اور وہ اب دو نہیں ہو اس کا پانچہزار روپیہ واپس لوٹانا بیوقوفی ہوگی۔ اس سے ایک طرف اس کا دل توڑ دو گے دوسری طرف تمہارا اپنا پروگرام محض روپیہ کی وجہ سے ناکام ہو جائے گا۔ مجھ سے پوچھو تو تم سے شیریں کی ہمدردی یا محبت جو چاہو کہہ لو ایک خدا ساز بات ہے۔ میں اسے قسمت کا فیصلہ تصوّر کرتا ہوں میری رائے یہی ہے کہ روپیہ واپس نہ کرو۔ البتہ اگر مناسب سمجھو۔ تو شیریں کو اپنے پروگرام سے مطلع کر دو۔

خان بہادر نے خود بھی میری مدد کا وعدہ فرمایا اور کہا کہ وہ میری تحریک میں پوری طرح دلچسپی لیتے رہیں گے۔

میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں شیریں کا روپیہ واپس نہیں کروں گا اور دیہاتی پروگرام کو دوبارہ ہاتھ میں لینے سے پہلے شیریں سے ایک دفعہ مل کر اپنا پروگرام سمجھاؤں گا۔ نیز میں نے کہا۔

میں آپ کے احسانات کا کہاں تک شکریہ ادا کروں۔ اس کی جزا آپکو خدا ہی دے گا۔ جہاں تک میرے دفتر بنانے کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا دفتر کسی گاؤں میں ہونا چاہیئے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو گاؤں میں موجود ہونے سے دیہاتی لوگ میرے قریب ہوں۔ وہ مجھے اپنے میں سے تصور کریں۔ دوسرے شہری عوام اور اخبارات تنظیم کے متعلق بھانت بھانت کی قیاس آرائیاں کر کے مجھے مجبور نہ کر سکیں گے۔

کہ اپنا وقت ان کے سوالوں کے جواب دینے میں صرف کروں۔ اس وقت تک شہری آبادی میں میرا کوئی رسوخ نہیں اور نہ اسے پیدا کرنے کا موقع یا ضرورت ہی ہے۔ دیہات منظم ہو گئے تو شہروں کو راہ پر لانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

اپنے کمرہ میں واپس آ کر میں نے ایک طویل خط شیریں کے نام لکھا اس میں اپنے آئندہ پروگرام کی ساری تفصیل بتا دی۔ اور کہہ دیا کہ ہمیں شادی کو اسمبلی کے انتخابات کے بعد تک ملتوی کر دینا چاہیئے۔ اگر میں اپنے ارادہ میں کامیاب ہو گیا تو ہماری شادی ملک کا ایک اہم واقعہ ہوگی۔ لیکن اگر میں ناکام رہا تو بھی ادھر سے فارغ ہوتے ہی مناسب طریق پر اس کے والدین سے سلسلہ جنبانی کروں گا۔ میں نے خط کے آخر میں شیریں سے درخواست کی کہ وہ میرے دیہات کو روانہ ہونے سے پہلے خان بہادر کے مکان پر آ کر مجھ سے مل لے تو بہت اچھا ہو۔ تاکہ میں اپنی زبان سے بھی اس سے گفتگو کر سکوں۔ میں نے اسے بتا دیا کہ خان بہادر ہمارے معاملہ سے آگاہ ہیں اس لئے ان کے مکان پر آنے میں اسے ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیئے۔ شیریں کے مکان پر میرا خود جا سکنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے اصرار کیا کہ وہ مجھ سے خود ہی آ کر ملے۔

میرے خط لکھنے کے تیسرے دن بعد شیریں صبح ہی خان بہادر کے مکان پر آ گئی۔ میں نے مختصر طور پر اپنا پروگرام سمجھایا۔ اور اس سے رخصت چاہی۔ اس نے اصرار کیا کہ میں اپنے پروگرام کا کوئی حصہ اس کے

سپرد بھی کر دوں۔ اس کی دلیل یہ تھی۔

"میں گریجویٹ ہوں۔ پڑھی لکھی ہوں۔ آخر شادی کے بعد بھی تو مجھے آپ کی ذمہ داریوں میں ساتھ دینا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ میں ابھی سے اپنی آئندہ ذمہ داریوں کو سمجھنے کی کوشش نہ کروں۔"

میں نے بہ مشکل اسے قائل کیا کہ ہر کام کے لئے وقت مقرر ہوتا ہے۔ جب وہ وقت آتا ہے۔ تو قدرت خود بخود اس کام کو کرانے کے لئے موزوں ترین لوگوں کو چن لیتی ہے۔ جب وہ مناسب سمجھے گی۔ شیریں کے لئے خدمت خلق کا موقع پیدا ہو جائے گا۔

شیریں کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے ایڈیٹر انسان سے ملاقات کی اسے اپنا دیہاتی پتہ دے کر کہا کہ وہ صوبہ کے مشہور اخبارات میرے نام وی۔ پی بھجوا دے۔ تاکہ مجھے صوبہ کے حالات کا صحیح علم ہوتا رہے اور میں شہری لوگوں کی سرگرمیوں سے بھی لاعلم نہ رہوں۔ شام کو خان بہادر سے اجازت لی اور میں گاڑی میں بیٹھ کر موضع گمرام کو روانہ ہو گیا۔

پروگرام

گجرام پہنچتے ہی میں نے صوبہ کے عاملوں کو اکٹھا کیا۔ وہ تنظیم کے متعلق کچھ ڈھلمل یقین ہو رہے تھے۔ وہ اپنا پروگرام بھول کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے میں نے ان میں پھر زندگی کی لہر دوڑائی۔ اور ایک دفعہ اور ان سب کو مصروفِ عمل کر دیا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ شہری آبادی سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں گاؤں ہی میں اٹھ آیا ہوں۔ اور گاؤں ہی میں میرا دفتر ہوگا تو خوشی سے ان کے چہرے کھل گئے۔ اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے کام کا ہرج کرکے بھی تنظیم کے لئے وقت نکالیں گے۔ میں نے گجرام میں ایک گھوڑا خریدا اور دیہات کا دورہ کرنے لگا۔ ہر روز صبح کو اٹھتا اور شام تک بعض دفعہ دس دس گاؤں میں ناظموں اور عاملوں سے مل آتا۔ تین مہینے میں صوبہ کے دیہات منظم ہو گئے۔ زمینداروں کے ذہن میں یہ بات عقیدہ کی طرح بیٹھ گئی کہ اس انتخاب میں وہ ووٹ صرف اسی امیدوار کو دیں گے۔ جسے وہ خود کھڑا کر سکیں۔ میں نے وہ تکلیفیں بار بار ان کے سامنے دہرائیں جن سے ان کا دوچار ہونا ضروری تھا۔ مگر ہر دفعہ انہوں نے ثابت قدم رہنے کا وعدہ کیا۔

میں نے صوبہ کے تمام نگرانوں ناظموں اور عاملوں کا گجرام میں ایک

جلسہ منعقد کیا اور ان سے پوچھا کہ وہ اپنے اپنے علاقہ سے کس کس کو امیدوار بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کو سمجھا دیا کہ امیدوار کے لئے پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ وہ ہر معاملہ پر رائے زنی کر سکے۔ حاضرین جلسہ نے باہمی مشورہ کے بعد اپنے اپنے حلقہ کی طرف سے امیدواروں کے نام مجھے لکھوا دیئے۔ اور یہ طے ہو گیا کہ ان کے صرف وہی نمائندے اسمبلی کے ممبر بنیں گے۔ جن کے نام انہوں نے لکھا دیئے ہیں۔ میں نے اس فہرست کو غور سے پڑھا تو معلوم ہوا کہ پرانے ممبروں میں سے ایک کو بھی انہوں نے نامزد نہیں کیا۔ گجرام کے دیہاتی حلقہ نے میرا نام پیش کیا۔ میں خود بھی اسی علاقہ سے امیدوار کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ اس لئے معاملہ ہر پہلو سے اطمینان بخش رہا۔ چند دن کے بعد سرکاری اعلان کے مطابق سب امیدواروں نے اپنے اپنے کاغذات نامزدگی متعلقہ مجسٹریٹوں کے سامنے پیش کر دیئے اور ہمارے سارے امیدوار حکومت کے منظور شدہ امیدوار قرار دیئے گئے انتخابات میں ابھی ڈیڑھ مہینہ باقی تھا۔ ہمارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے یہ طے ہو گیا تھا کہ ہر ووٹر انتخاب کے دن اپنا سارا کاروبار چھوڑ کر اپنے خرچ پر پولنگ اسٹیشن تک جائے گا۔ اور اپنے امیدوار کے حق میں ووٹ دیگا۔ نگرانوں، ناظموں اور عاملوں نے ذمہ لیا کہ ان کے حلقوں میں سے کوئی زمیندار ووٹ دیئے بغیر نہیں رہے گا۔

تین خط

شیریں، خان بہادر اور ایڈیٹر "انسان" کا بے بگاہے مجھے خط لکھتے رہے اور میں ان کا جواب دیتا رہا۔ میری ڈاک موضع گھرام کے پتہ پر آتی تھی میں بعض دفعہ ہفتہ ہفتہ بھر دورہ پر رہتا۔ واپس آتا تو ڈاک دیکھنے کی فرصت ملتی۔ ایک دن میں حسب معمول دورہ سے واپس آیا تو دیکھا کہ میرے نام کے تین لفافے دھرے ہیں۔ میں دستخط پہنچانتا تھا نیلے رنگ کا لفافہ شیریں کی طرف سے تھا۔ اسے چاک کیا لکھا تھا۔

میرے محبوب

جوں جوں اسمبلی کا انتخاب قریب آ رہا ہے۔ میرا ہیجان بڑھ رہا ہے خدا آپ کو اپنے بلند مقاصد میں کامیاب کرے۔ اور آپ کا حافظ و ناصر ہو۔ غالباً آپ کو شہری حالات کا کم علم ہوگا آج کے خط میں ایک خاص خبر آپ تک پہنچاتی ہوں۔ ادشا کی شہری تنظیم ان دنوں بڑے زور پر ہے۔ ریاض آباد کے علاوہ وہ دوسرے شہروں کا بھی دورہ کرتی ہے اور ہر جگہ اس کی تقریر سننے کے لئے ہزاروں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ میں خود بھی اس سے مل چکی ہوں۔ وہ کسی عام نشست سے امیدوار کھڑی نہیں ہوئی

بلکہ مزدوروں کے مخصوص حلقہ سے اس نے اپنے آپ کو نامزد کرایا ہے۔ میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے ہنس کر جواب دیا۔

"عام نشستیں فرقہ دار ہیں۔ میں کسی خاص فرقہ کی نمائندہ نہیں بننا چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے ووٹر ہر فرقہ کے لوگ ہوں۔"

اسمبلی میں دیہاتی نشستیں بہت زیادہ ہیں اگر یہ سب نشستیں آپ کی پارٹی جیت جائے تو شہری آبادی کے نمائندوں کا تعاون آپ کے لئے ضروری نہیں ہوگا آپ اپنی طاقت سے ہی وزارت مرتب کر سکیں گے۔

میں نے باتوں ہی باتوں میں اوشا سے آپ کا ذکر بھی کیا اس پر وہ کچھ خاموش سی ہوگئی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی پھر ایک اور بات کرتے کرتے وہ یکایک آپ کا پتہ پوچھنے لگی میں نے بتا دیا۔ اس پر اس نے میرے حالات کی کرید شروع کر دی۔ مگر میں اسے ٹالتی ہی رہی۔ شاید وہ آپ کو خط لکھے۔

آپ کی

سشبریں

دوسرا خط خان بہادر کا تھا۔

عزیزم مکرّم!

آپ نے جو بیڑا اٹھایا ہے۔ خدا آپ کو اس میں کامیابی دے۔ آپ کی تنظیم وغیرہ سب درست سہی۔ لیکن آپ کی قابلیت کا صحیح امتحان اب شروع ہونے والا ہے وزیر اعظم نے موجودہ ممبروں کا ایک اجلاس اپنی کوٹھی پر کل بلایا تھا تاکہ اسمبلی کے ہونے والے انتخاب کے متعلق غور کیا جائے۔ بڑی دھواں دھار تقریریں بھی ہوئیں۔ اور بہت سے ممبروں نے وزیر اعظم کی پالیسی پر شدید نکتہ چینی کی۔ وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں ان کو یقین دلایا کہ اس کے دوبارہ وزارت مرتب کرنے پر موجودہ پالیسی بدل دی جائے گی۔ بعض ممبروں نے آپ کا نام بھی لیا۔ کہ دیہات آپ کے زیر اثر ہیں۔ اور پرانے ممبروں کو ووٹ کم ملنے کی امید ہے۔ باہمی مشورہ کے بعد ان لوگوں نے طے کیا کہ دیہاتی لوگوں کے ووٹ روپے سے خریدے جائیں اور دیہات کے ملاؤں، پنڈتوں اور گیانیوں کو جتنی جلدی ہو سکے قابو میں کیا جائے تاکہ ان سے دیہاتی لوگوں پر اثر ڈالا جا سکے۔ وزیر اعظم کی پارٹی فنڈ میں چھ لاکھ روپیہ جمع ہو چکا ہے۔ اس سے ملاؤں، پنڈتوں اور گیانیوں کے وظیفے مقرر کیے جائیں گے اور جو ووٹر کسی طرح راہ پر نہ آئیں انہیں روپیہ دے کر منا یا جائیگا۔ اسمبلی کے انتخاب تک وزیر اعظم کا پارٹی فنڈ دس لاکھ روپیہ تک پہنچ جائے گا مجھے بڑے معتبر

ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس نے درپردہ فیصلہ کیا ہے کہ جو آدمی اس پارٹی فنڈ میں پچاس ہزار روپیہ دے گا۔ اسے نائٹ بنا دیا جائیگا۔ پچیس ہزار دینے والا خان بہادر۔ رائے بہادر یا سردار بہادر بنا دیا جائے گا۔ اور جسے خان صاحب، رائے صاحب یا سردار صاحب بننا ہوگا وہ دس ہزار روپیہ دے۔ اس کے علاوہ آنریری مجسٹریٹی کے لئے پانچ ہزار کی رقم طے ہوئی ہے۔ اعزاز کے خواہشمند لوگ دھڑا دھڑ روپیہ وزیر اعظم کے فنڈ میں ادا کرکے اپنا نام درج کرا رہے ہیں۔ اور جتنا زیادہ روپیہ جمع ہو رہا ہے اتنا ہی زیادہ انتخاب میں پارٹی کی کامیابی کا امکان بڑھ رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ اس طوفان کا مقابلہ کس طرح کرتے ہیں جو ریاض آباد سے اٹھ کر دیہات پر چھانے والا ہے۔

خیر اندیش

شمشیر علی

میں تیسرا خط کھولتے ہوئے بہت گھبرایا۔ دستخط سے صاف ظاہر تھا کہ یہ اوشا کا خط ہے۔ اوشا اب کیا چاہتی ہے؟ کیا اس نے اپنی شہری تنظیم کی کامیابی پر اس خط میں میرا مذاق اڑایا ہے؟ اس نے مجھے گھٹیا درجہ کا آدمی کہا تھا اس خط کا نفس مضمون خواہ کچھ ہو۔ کیا اوشا کا مجھے مخاطب کرنا ہی اس کی کمزوری نہیں؟ کیا اس نے مجھے نہیں کہہ دیا تھا کہ آئندہ میرا اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ میں خیالات میں کھو گیا۔ جتنے واقعات میرے اور اوشا کے درمیان

گزرے تھے۔ایک ایک کرکے وہ سب میری آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ مجھے وہ تاریخیں اور لمحات یاد آ گئے۔جن میں اوشا سے میری ملاقاتیں ہوئی تھیں۔چند لمحوں کے لئے میں اپنے ماضی میں یکسر کھو گیا۔اس ماضی میں نہیں جو گزرے ہوئے مہیب حادثوں اور روح فرسا واقعات سے پر تھا۔ بلکہ اس ماضی میں جو مجھے پہلی مرتبہ نیشنل ہال میں اوشا کی تقریر سننے لے گیا تھا۔جس نے مجھے نئے سرے سے اخبار نویس بنا دیا جس نے تنظیم کے نام پر مہینہ بھر مجھ سے دیہات کی خاک چھنوائی۔جس نے اوشا کو میرے انتظار میں بے خواب اور مضطرب رکھا تھا۔انسانی زندگی کتنی تغیر پذیر ہے۔نہ خوشی کو ثبات ہے نہ غم کو دوام۔

نہ معلوم میں کتنی دیر خیالات میں غلطاں رہا۔جب اپنے آپ میں آیا تو لفافہ کھولا تحریر پڑھی۔

ڈیئر بشیر

مجھے آپ سے بعض باتیں کرنی ہیں آپ جب ریاض آباد آئیں تو مجھ سے ضرور ملیں۔ مجھے ریاض آباد میں اپنی جائے رہائش کی اطلاع کر دیں تو میں موٹر بھیج آپ کو خود بلا لوں گی۔ مخلصہ

اوشا

شیریں اور خان بہادر کے خطوط میں نے طے کرکے رکھ لئے کہ جواب پھر کبھی لکھ دیا جائیگا۔ مگر اوشا کو میں نے اسی وقت لکھ دیا کہ انتخاب ختم ہونے سے پہلے ...ریاض آباد میں وارد ہونے کا میرا پروگرام نہیں تاہم میں جب بھی

ریاض آباد آیا آپ سے ملوں گا۔

انتخاب

انتخاب سے پہلے میں نے تمام نگرانوں۔ ناظموں اور عاملوں کو گجرام میں بلا یا۔ اور انہیں بتایا کہ عنقریب وزارتی پارٹی کے کارکن روپوں کے تھیلے اور نوٹوں کے بنڈل لے کر ٹڈی دل کی طرح دیہات پر چھانے والے ہیں۔ اور وہ سب سے پہلے ملاؤں، پنڈتوں اور گیانیوں کو رقمیں پیش کریں گے۔ اس کے بعد انفرادی طور پر ووٹ خریدے جائیں گے۔ میں نے اس بات پر خاص زور دیا کہ ہمارے ووٹر کوئی ایسی حرکت نہ کریں جو انصاف کے خلاف ہو۔ یا جس سے شرارت کا پہلو نکلتا ہو۔ ہمارے ایک ایک امیدوار کے مقابلے پر بعض حلقوں میں دو دو تین تین امیدوار کھڑے تھے۔ اور ہر حلقہ سے وزارتی پارٹی کا امیدوار ضرور موجود تھا۔ در اصل زیادہ امیدوار انہیں لوگوں نے کھڑے کر دیئے تھے تاکہ ہمارے امیدواروں کے ووٹ زیادہ امیدواروں پر بٹ جائیں اور وزارتی پارٹی کے امیدوار کامیاب ہو جائیں۔

آخر انتخاب شروع ہوا۔ وہ دیہات جن کے رہنے والوں کو شہر

کے رؤساء کیڑوں کوڑوں سے بھی بدتر سمجھتے تھے۔ اس وقت وہ دیہات خاں بہادروں اور رائے بہادروں کی موٹروں سے بھرے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے شیخ اور ملک گاؤں گاؤں میں غریب لوگوں سے اپنا شجرہ نسب ملاتے پھرتے تھے۔ خان بہادر صمصام الملک نے ثابت کردیا کہ موضع گجرام کا گھوسی ہریارشتہ سے اس کی پھوپھی کا لڑکا ہے۔ رائے بہادر امیر جیند نے صاف کہہ دیا کہ ناخنوں سے ماس جدا نہیں ہوسکتا۔ ننھو پانڈی کو وہ چھاتی سے لگائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کا خاندان ننھو کے چچا کی خالہ کے بھائی رامو سے سات پشت اوپر جاکر مل جاتا ہے۔ ملک طرار خاں آج خالص اسلامی لباس پہنے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں تسبیح، بغل میں مصلا تھا۔ ان کا ارشاد تھا کہ اسمبلی کا ممبر صرف اس مسلمان کو بنانا چاہئے جو وضع قطع سے مسلمان اور نماز کا پابند ہو۔ قاضی انتخاب الدین فرما رہے تھے کہ جب سے میں نے سنا ہے کہ دیہاتی بھائیوں کو دھوپ میں بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ مجھے پسینے پر پسینہ آرہا ہے۔ جب ہمارے بھائی ہی دکھ میں ہوئے تو ہمارا آرام کس کام کا۔ دیہات میں وارد ہونے والا ہر نیا آدمی کوئی نہ کوئی بھروپ بھر کر آرہا تھا۔ دیہاتی لوگ سب کی سنتے خود کچھ نہ کہتے۔ ملاؤں اور پنڈتوں کے وارے نیارے تھے۔ ان کو قوم کے صحیح نجات دہندہ اور علمی تبحر میں ارسطو کے استاد ظاہر کیا جارہا تھا۔ وہ اپنی خوشامد پر مسکراتے اور خاموش ہو رہتے۔ ہر نووارد کی تان اسی نقطہ پر آکر ٹوٹ رہی تھی "آپ ایک دفعہ ہمیں ووٹ دیں اور پھر

دیکھیں کہ ہم کیا کچھ کر دکھاتے ہیں :

ہمارے نگرانوں، ناظموں اور عاملوں نے اپنے کسی پہلے طے کئے ہوئے پروگرام کے مطابق اپنے اپنے حلقہ میں اجلاس منعقد کئے جن میں انہوں نے باہر کا کوئی آدمی شریک نہ ہونے دیا۔ خود مجھے بھی انہوں نے گجرام میں منعقدہ اجلاس میں شریک ہونے کے لئے دعوت نہ دی۔ اور صرف اتنا کہہ دیا کہ یہ اجلاس اس بات پر غور کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ کہ دیہات میں آنے ہوئے شہری مہمانوں سے کیا سلوک کیا جائے۔ مجھے اپنے اخلاص اور صداقت پر بھروسہ تھا۔ اس لئے میں نے اس اجلاس کی کارروائی کرید کرید کر پوچھنے کی کوشش نہ کی بلکہ کسی نے اس کا ذکر کیا تو میں نے بات ٹال دی۔

میں دیکھتا کہ شہری کارکنوں کے چہرے مطمئن اور آنکھیں روشن ہیں۔ وہ زمین پر اکڑ اکڑ کر چل رہے تھے۔ گاؤں گاؤں میں دیگیں چڑھی تھیں۔ پلاؤ زردہ پک رہا تھا۔ غریب دیہاتی بڑھ بڑھ کر ہاتھ صاف کر رہے تھے کہیں کہیں شہری کارکنوں کو دیہاتیوں سے پگڑی تبدیل کرتے بھی دیکھا گویا اس طرح وہ گہری دوستی کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ بچوں کو شیرینیاں تقسیم ہو رہی تھیں۔ اور شام کو مسجدیں اور منادر آباد نظر آ رہے تھے غرضیکہ دیہات کا نقشہ ہی بالکل بدل گیا تھا۔ شہری کارکن یہ کہتے سنے گئے۔

• آپ ہمیں ووٹ دیجئے۔ پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اسی سال اس گاؤں

کو بہشت کا نمونہ نہ بنا دیں تو سہی۔"

یہ سب کچھ تھا۔ مگر ہمارے امیدوار، نگران، ناظم، عامل سب غائب تھے مجھے رہ رہ کر حیرانی ہوتی کہ یہ لوگ کہاں جا چھپے ہیں۔ ہر چند کہ میں دیہاتی آبادی کی ذہنی تربیت پورے طور پر کر چکا تھا۔ دل میں کبھی کبھی شبہ سا ہوتا کہ دیہاتی لوگ پہلے کی طرح اب بھی شہریوں کے بھرّے میں نہ آجائیں۔ مرعوب ہو کر اپنے مقصد کو نہ بھول جائیں۔ ایسا نہ ہو ہمارا پروگرام فیل ہو جائے پھر خود ہی سمجھ میں آگیا کہ انسان کا کام پورے خلوص کے ساتھ جان توڑ کر محنت کرنا ہے۔ اس کے بعد نتیجہ خدا کے ہاتھ ہوتا ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ خدا کا کام باقی ہے۔ نتیجہ کے متعلق شبہ کرنا گویا خدا کے انصاف پر بے اعتمادی ظاہر کرنا ہے۔ اگر اس نے مجھ جیسے کمزور انسان کو ان بے گناہ اور مظلوم دیہاتیوں کے لیے یہ کچھ کرنے کی توفیق دی۔ جو میں اب تک کر چکا ہوں تو وہ اب ان کی طرف سے غافل رہیگا؟ نہیں ہرگز نہیں!

آخر انتخاب ختم ہوا۔ شیریں اپنے خطوط میں تقاضے پر تقاضہ کرنے لگی کہ میں فوراً ریاض آباد پہنچ جاؤں۔ اور اسے اپنی ساری کاروائی سے بالمشافہ مطلع کروں۔ مجھے جو کچھ آئندہ کرنا ہے وہ ریاض آباد آ کر کروں۔ خان بہادر ناراض ہو رہے تھے کہ مجھے فی الفور ریاض آباد میں اپنی پارٹی کا دفتر بنا کر شہری لوگوں کو اپنی پارٹی کے وجود سے آگاہ کر دینا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ باقاعدہ پارٹی موجود نہ ہونے کی وجہ سے ممبرے

کامیاب امیدوار دوسری پارٹیوں کی جنبہ بندیوں سے متاثر ہو کر ان سے جا ملیں ۔ ایڈیٹر "انسان" کے خطوط سے اور بھی زیادہ اضطراب مترشح تھا وہ بار بار مجھے لکھ رہا تھا تم نے اپنی پارٹی کا پروگرام کیوں نہیں شائع کیا ۔ شہری آبادی کو یہ یقین تک ہو چکا ہے کہ دیہاتی آبادی پہلی وزارت سے مطمئن نہیں ۔ اور وہ اپنے لئے کوئی اور راستہ تلاش کر رہی ہے ۔ لیکن ساتھ ہی شہری لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ دیہاتی لوگوں کا لیڈر کوئی نہیں ۔ رفتہ رفتہ وہ سب کے سب پہلی وزارتی پارٹی ہی میں جذب ہو جائیں گے ۔ سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ پہلی وزارتی پارٹی نے اپنے پروگرام پر اگرچہ کبھی عمل نہیں کیا ۔ لیکن اس میں صوبہ کے مفاد کی سب باتیں موجود ہیں ۔ اس سے مختلف پروگرام کہاں سے لاؤ گے ۔ ان لوگوں نے کئی دفعہ دعویٰ کیا ہے ۔ کہ کوئی دوسری پارٹی انکے پروگرام سے بہتر پروگرام پیش نہیں کر سکتی ۔

اس تمام اصرار کے باوجود میں نے فیصلہ کیا کہ انتخاب کا نتیجہ نکلنے پر کامیاب امیدواروں سے گجرام ہی میں مل کر میں ریاض آباد واپس جاؤں گا ۔ اس سے پہلے نہیں ۔ میں نے اپنے اس فیصلہ کی اطلاع شیریں، خان بہادر اور ایڈیٹر انسان کو دے دی ۔ شیریں اور خان بہادر نے بالآخر محبت سے اتفاق کیا ۔ لیکن ایڈیٹر انسان ایک دفعہ پھر کو بذات خود گجرام پہنچ گیا ۔ بہت شکوے شکایت ہوئے ۔ آخر بولا ۔ بھائی پہلی وزارتی پارٹی ختم ہو چکی ہے ۔ انتخاب کا نتیجہ نکلنے میں

ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ مگر ان لوگوں کے چہروں پر ابھی سے ہوائیاں
چھوٹ رہی ہیں۔ انہیں پتہ لگ گیا ہے کہ وہ اب کے ہڑپ نہیں سکتے
اور مرادشا تمام شہری نشستوں پر قبضہ کرتی نظر آتی ہے۔ جن شہری
امیدواروں کا کامیاب ہونا یقینی ہے وہ سب ادشا کی پارٹی میں
شامل ہو چکے ہیں۔ تم یہاں آرام سے بیٹھے ہو۔ اور ریاض آباد میں
ابھی سے لوگ دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ آخر ہمیں معلوم تو ہو تمہاری
طاقت کتنی ہے؟ کتنے ممبر تمہارا ساتھ دیں گے؟ تم آئندہ کیا کرنا چاہتے
ہو؟ تمہارا پروگرام کیا ہے؟ تم نے اخباروں کا بائیکاٹ کیوں کر رکھا
ہے۔ انتخاب ہو چکا۔ کم از کم اب تو عوام کو تمہارے ارادے معلوم ہونے چاہئیں
لاؤ تمہارا پروگرام کہاں ہے؟"

میں نے اسے سمجھایا۔

"تمہیں غلط فہمی ہے کہ میں کسی جماعت کا لیڈر ہوں۔ میں نے دیہات
کی تنظیم ضرور کی ہے۔ اور دیہات کی ساری نشستیں ہمارے قبضہ میں
آجانی یقینی معلوم ہوتی ہیں۔ میں نے امیدواروں کو کہلا بھیجا ہے۔ کہ
انتخاب کا نتیجہ نکلنے کے دو دن بعد یہاں آجائیں۔ تاکہ بہت سی
باتوں پر غور کیا جاسکے۔ ان باتوں میں لیڈر کا انتخاب بھی ہے۔ میں
نے سوچ لیا ہے۔ اس کے لئے بھی کامیاب ممبروں کی منظوری ضروری
ہے۔ میں ان ممبروں سے بات چیت کرنے کے بعد ہی
ریاض آباد آسکتا ہوں۔"

ایڈیٹر نے مصر ہوکر میرا مجوزہ پروگرام دریافت کیا۔ میں نے اسے بتایا۔

۱۔ صوبہ میں جو کانیں موجود ہیں اور آج تک گورنمنٹ نے ان سے صوبہ کے لئے فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہم انہیں کھودیں گے۔ اور آمدنی کا موثر ذریعہ بنا کر دیہات کا پچاس فیصدی لگان اور شہروں کا پچاس فی صدی ٹیکس گھٹا دیں گے لگان اور ٹیکس میں تخفیف ہماری گورنمنٹ بن جانے کے دو سال بعد سے شروع ہو جائے گی۔

۲۔ جو قابل سائنس دان۔ شاعر۔ ادیب۔ طبیب۔ مصور اپنی زندگی محض اپنے فن کی تکمیل کے لئے وقف کرنا چاہیں انہیں معقول ماہوار وظیفہ دیا جائے گا۔ اس مد کے لئے ہر سال بجٹ میں پانچ لاکھ روپیہ منظور کیا جائے گا۔

۳۔ اسی فیصدی ملازمتیں امتحان مقابلہ سے پر کی جائیں گی۔ امتحان کے لئے ایک بورڈ مقرر کیا جائے گا۔ جس کا صدر ہماری پارٹی کا لیڈر یعنی وزیر اعظم ہوگا۔ امتحان مقابلہ سال میں صرف ایک بار ہوگا۔ اور امتحان کے وقت صدر کی حاضری ضروری ہوگی۔ باقی بیس فی صدی ملازمتیں سفارشوں کے ذریعے پر کی جائیں گی۔ سفارش میں جو بڑھے سو پائے۔

۴۔ ہندو مسلم اتحاد کے لئے ایک بورڈ بنایا جائے گا جس کا کام صرف فسادات کی صورت میں فسادیوں کا پتہ لگانا ہوگا۔ سزا دینا اس بورڈ کے اختیار میں نہیں ہوگا۔ سزا دینے کے لئے عدالتی کاروائی ہوگی۔

۵۔ جن ملازموں کی حق تلفی ہو۔ انہیں حق ہوگا کہ وہ اپنا کیس آخری فیصلہ کے لئے وزیر اعظم کے پاس بھجوا سکیں۔

۶۔ وزیر اعظم ہفتہ میں دو دن لوگوں کی شکائتیں سننے کے لئے وقف کریگا۔ جو شخص اپنی تکلیف پیش کرنی چاہے وہ وزیر اعظم سے مل کر اظہار مدعا کر سکے گا۔

۷۔ رشوت لینے والے اور بے انصاف حاکموں کے خلاف مقدمے چلا کر انہیں جرمانہ اور قید کی سخت سزائیں دی جائیں گی۔

۸۔ صوبہ میں مدرسے اور ہسپتال کثرت سے کھولے جائیں گے۔

آزمائش

اسمبلی کے کل تین سو ممبر تھے۔ پچاس شہری اور اڑھائی سو دیہاتی ہماری پارٹی صرف دیہاتی نشستوں کے لئے لڑی اور اڑھائی سو میں سے سوا دو سو لے مری۔ یہ سوا دو سو ممبر گرام میں جمع ہوئے اور انہوں نے متفقہ طور پر مجھے اپنا لیڈر منتخب کر لیا۔ میں نے اپنے ممبروں کو اس اجلاس میں تفصیل کے ساتھ بتایا کہ میری حکومت کا کیا پروگرام ہوگا۔ اور وہ کس طرح کام کرے گی۔ جلسہ کے برخاست ہوتے ہی میں ریاض آباد کو روانہ ہوا۔ اور چند گھنٹوں کے بعد خان بہادر سے باتیں کر رہا تھا۔

خان بہادر نے مجھے بتایا کہ دوسرے ملکوں میں وزارتوں کی ترتیب کیا ہوتی ہے اور وہ کس کس اصول کو حکمت عملی بناتی ہیں۔ اس علمی گفتگو سے فارغ ہوئے تو خان بہادر نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنے ممبروں کی فہرست گورنر کو فوراً بھیج دوں۔ تاکہ رسمی طور پر اسے معلوم ہو جائے کہ صوبہ کے نمائندوں کی بہت بڑی اکثریت میرے ساتھ ہے۔ اور وہ مجھے بلا کر سن لیں۔ کہ کس کس ممبر کو میں نے وزیر بنایا ہے۔ میں نے خان بہادر کے ٹائپسٹ سے اسی وقت ایک چھٹی

گورنر کے نام ٹائپ کرائی اور اپنی پارٹی کے ممبروں کی فہرست اس سے منسلک کر کے گورنر کو بھیج دی۔ خان بہادر کی زبانی معلوم ہوا کہ تمام شہری ممبر اوشا کے اشارہ پر چل رہے ہیں۔ اور مٹھی کی انگلیوں کیطرح جدا جدا ہوتے ہوئے بھی سب ایک ہیں۔ ان کی تعداد صرف پچاس ہے۔ تین سو کی اسمبلی میں پچاس ممبر کوئی اہمیت نہیں رکھتے لیکن یہ پچاس ممبر سب کے سب شہری ہیں۔ اس لئے ان کو نظرانداز کرنا گویا صوبہ بھر کی شہری آبادی کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا ہے۔ ان سے کوئی نہ کوئی معاہدہ کر کے شہری ممبروں کو اپنی پارٹی میں شامل کرنا ضروری ہے۔ ورنہ شہری اور دیہاتی آبادی کے درمیان رفتہ رفتہ نفرت پیدا ہو جائے گی۔ جس کا نتیجہ فسادات کی صورت میں برآمد ہوگا۔ میں نے خان بہادر سے وعدہ کیا کہ ان کے اس ارشاد پر غور کروں گا اور ان سے رخصت ہوا۔

خان بہادر نے میرے لئے ایک بنگلہ کرایہ پر لے کر فرنیچر سے آراستہ کروا دیا تھا۔ خان بہادر کا خیال تھا کہ میں ان کے ہاں سے سیدھا اپنے بنگلہ پر جاؤں گا۔ جہاں اخبار نویس اور فوٹوگرافر وغیرہ مجھ سے ملاقات کریں گے۔ مگر میں نے خان بہادر کے ہاں سے نکلتے ہی شیریں کے مکان کا رخ کیا۔ میں عام حالات میں شیریں کے ہاں شائد نہ جاتا اسے خان بہادر کے گھر بلا کر مل لیتا یا اپنے بنگلہ پر اسے بلا بھیجتا۔ لیکن اب جبکہ مشہور ہو چکا تھا۔ مجھے بڑائی ملنے والی ہے۔ میرا فرض ہو گیا

کہیں خود چل کر اپنے متعلقین سے ملوں۔ اور انہیں احساس نہ ہونے دوں کہ میری اور ان کی پوزیشن کے درمیان کوئی فرق پیدا ہو رہا ہے۔

شیریں کے مکان پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ حسب معمول شیریں کے والد گھر پر موجود نہیں۔ شیریں فوراً باہر آئی اور مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ میرا قیاس تھا کہ شیریں پہلے سے زیادہ صحت مند اور شگفتہ ہوگی۔ اس کے روئیں روئیں سے شعریت کے چشمے پھوٹ رہے ہوں گے۔ لیکن اس وقت جو شیریں میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ آنکھوں کے گرد بے خوابی نے گہرے ڈال دیئے تھے۔ اور وہ خود اپنی ہجو معلوم ہوتی تھی مجھے اس کی حالت دیکھ کر سخت اچنبھا ہوا۔ میں نے بڑی بیتابی سے پوچھا۔

"شیریں تم بیمار ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "نہیں"

اور گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میرے ذہن میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ خیال آیا کہ شیریں کو شبہ ہو گیا ہے۔ شاید وزیر اعظم بننے کے بعد میں اسے بھول جاؤں۔ اور کسی زیادہ امیر گھرانے کی لڑکی سے شادی کر لوں۔ میں نے اس سے زیادہ سوال کرنے کی بجائے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اب ہماری شادی کی تاریخ مقرر ہو جانی چاہیئے۔ میں شادی کے لئے بالکل تیار ہوں۔ اور اب فدرے فرصت بھی ہے۔ دو چار دن میں وزارت مرتب ہو جائے گی۔ تمہیں جلد از جلد اپنے گھر میں آ کر گھر کی ذمہ داری سنبھالنی چاہیئے۔ اس بارے میں تمہارے والد کی کیا رائے ہے۔"

میں نے دیکھا کہ میرے ان الفاظ سے شیریں کے چہرہ پر زندگی کی لہر دوڑ گئی اور اس کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو گیا۔

شیریں:۔ والد سے والدہ بات کر چکی ہیں انہیں کوئی اعتراض نہیں تاریخ آپ میرے والد سے مل کر طے کیجئے۔

میں:۔ میں چاہتا ہوں۔ یہ معاملہ جلد سے جلد طے ہو جائے وزارت کی ذمہ داریاں بہت بڑی ہیں۔ آرام دہ گرہستی زندگی اور تم جیسی پری چہرہ فرشتہ سیرت رفیقۂ حیات میری ان ذمہ داریوں کو میرے لئے آسان بنا دے گی۔"

شیریں:۔ شہری ممبروں سے آپ نے کیا تصفیہ کیا ہے؟ ان کی لیڈر ادشا ہے۔ ادشا تو آپ کی پالیسی سے اختلاف معلوم ہوتا ہے میں کئی دفعہ اس سے مل چکی ہوں۔ اس معاملہ پر وہ گم سم ہے۔ اس نے اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ میں اسمبلی کے انتخاب سے لے کر تقریباً سارے اخبارات پڑھتی رہی ہوں۔ سب اخبارات خطرہ کا اظہار کر رہے ہیں کہ اگر شہری پارٹی کو رضامند نہ کیا گیا تو شہری

اور دیہاتی کی تفریق ایک مستقل تفریق بن جائے گی۔ جس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔"

"میں:- آپ نے اوشا کی حمایت نہایت مناسب الفاظ میں کی ہے۔ میری ہونے والی رفیقۂ حیات! میں بے انصافی نہیں کروں گا۔ اوشا سے مجھے ذاتی اختلاف ہو یا نہ ہو۔ وہ ایک پارٹی کی لیڈر رہی ہے۔ اس کا حق ہے کہ اسے وزارت میں لیا جائے۔ یہی وہ چاہتی ہے۔ اور یہی میرا فیصلہ ہے۔ اب آپ خوش ہیں۔"

شیریں:- "آپ سمجھتے ہیں کہ وہ وزارت میں لئے جانے سے مطمئن ہو جائے گی۔"

میں:- "وہ سو فیصدی مطمئن ہو جائے گی۔"

شیریں:- "آپ کتنے اچھے ہیں۔"

میں جواب میں کچھ کہنے کو ہی تھا کہ شیریں کے والد آ گئے۔ ان سے میری یہ دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات کے وقت انہوں نے نوکر کو اندر سے بندوق لانے کے لئے دوڑایا تھا۔ اس دوسری ملاقات میں نوکروں پر برسے کہ وہ اندر سے پھلوں کے طشت فی الفور کیوں نہیں لائے۔ اور ابھی تک شربت وغیرہ سے میری تواضع کیوں نہیں کی۔ حالات کتنی جلدی تبدیل ہوتے ہیں۔ وہی مکان وہی وقت۔ وہی شیریں کا باپ اور وہی میں۔ پہلا سلوک جان لیوا۔ دوسرا انداز نیازمندی۔ بہرحال ہم جلد ہی گھل مل گئے۔

میں نے شیریں کے رشتہ کے لئے رسمی طور پر درخواست کی انہوں نے منظور فرمالی۔ بیس دن بعد کی تاریخ شادی کے لئے مقرر کردی گئی۔ قصہ ختم ہوا۔

دوسرے دن صبح نو بجے گورنمنٹ ہاؤس کا چپڑاسی میرے نام ایک سربمہر لفافہ لایا۔ کھولا تو یہ گورنر کی طرف سے ملاقات کی دعوت تھی لکھا تھا کہ میں پانچ بجے شام گورنمنٹ ہاؤس میں ان سے ملاقات کرلوں اور جن ممبروں کو میں وزیر بنانا چاہتا ہوں۔ ان کی فہرست ساتھ لیتا آؤں۔

میں نے غور وخوض کے بعد اپنے رفقائے کار یعنی باقی وزیروں کے نام کاغذ کے ایک پرزہ پر لکھ کر جیب میں ڈال لئے اور تیار ہوگیا۔ قاعدہ کے مطابق مجھے وزارت کے لئے تجویز کردہ ممبروں سے غیر رسمی طور پر پوچھ لینا چاہیے تھا کہ وہ وزیر بننے پر رضامند ہیں یا نہیں۔ لیکن یہاں میری پارٹی نے مجھے اس سلسلے میں کل اختیارات دیدیے تھے۔ کہ جس کو چاہوں وزارت کے لئے چن لوں۔ اس لئے میں نے کسی سے مشورہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور اپنی پارٹی کے باہر سے صرف ادشا کا نام میں نے شامل کیا تھا۔ ادشا کے متعلق مجھے یقین تھا کہ وہ وزیر بننے کو اپنی زندگی کی معراج سمجھے گی۔ اس لئے اس سے بھی میں نے غیر رسمی طور پر دریافت نہ کیا کہ اسے وزارت قبول ہے یا نہیں۔

اور دیہاتی کی تفریق ایک مستقل تفریق بن جائے گی۔ جس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔"

"میں:- آپ نے اوشا کی حمایت نہایت مناسب الفاظ میں کی ہے۔ میری ہونے والی رفیقۂ حیات! میں بے انصافی نہیں کروں گا۔ اوشا سے مجھے ذاتی اختلاف ہو یا نہ ہو۔ وہ ایک پارٹی کی لیڈر رہے۔ اس کا حق ہے کہ اسے وزارت میں لیا جائے۔ یہی وہ چاہتی ہے۔ اور یہی میرا فیصلہ ہے۔ اب آپ خوش ہیں۔"

شیریں:- "آپ سمجھتے ہیں کہ وہ وزارت میں لئے جانے سے مطمئن ہوجائے گی۔"

میں:- "وہ سو فیصدی مطمئن ہوجائے گی۔"

شیریں:- "آپ کتنے اچھے ہیں۔"

میں جواب میں کچھ کہنے کو ہی تھا کہ شیریں کے والد آ گئے۔ ان سے میری یہ دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات کے وقت انہوں نے نوکر کو اندر سے بندوق لانے کے لئے دوڑایا تھا۔ اس دوسری ملاقات میں نوکروں پر برسے کہ وہ اندر سے پھلوں کے طشت فی الفور کیوں نہیں لائے۔ اور ابھی تک شربت وغیرہ سے میری تواضع کیوں نہیں کی۔ حالات کتنی جلدی تبدیل ہوتے ہیں۔ وہی مکان وہی وقت۔ وہی شیریں کا باپ اور وہی میں۔ پہلا سلوک جان لیوا۔ دوسرا انداز نیازمندی۔ بہرحال ہم جلد ہی گھل مل گئے۔

میں نے شیریں کے رشتہ کے لئے رسمی طور پر درخواست کی انہوں نے منظور فرمالی۔ بیس دن بعد کی تاریخ شادی کے لئے مقرر کر دی گئی۔ قصہ ختم ہوا۔

دوسرے دن صبح نو بجے گورنمنٹ ہاؤس کا چپراسی میرے نام ایک سربمہر لفافہ لایا۔ کھولا تو یہ گورنر کی طرف سے ملاقات کی دعوت تھی لکھا تھا کہ میں پانچ بجے شام گورنمنٹ ہاؤس میں ان سے ملاقات کرلی اور جن ممبروں کو میں وزیر بنانا چاہتا ہوں۔ ان کی فہرست ساتھ لیتا آؤں۔

میں نے غور و خوض کے بعد اپنے رفقائے کار یعنی باقی وزیروں کے نام کاغذ کے ایک پرزہ پر لکھ کر جیب میں ڈال لئے اور مطمئن ہوگیا۔ قاعدہ کے مطابق مجھے وزارت کے لئے تجویز کردہ ممبروں سے غیر رسمی طور پر پوچھ لینا چاہیے تھا کہ وہ وزیر بننے پر رضامند ہیں یا نہیں۔ لیکن یہاں میری پارٹی نے مجھے اس سلسلے میں کل اختیارات دیدیے تھے۔ کہ جس کو چاہوں وزارت کے لئے چن لوں۔ اس لئے میں نے کسی سے مشورہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور اپنی پارٹی کے باہر سے صرف اوشا کا نام میں نے شامل کیا تھا۔ اوشا کے متعلق مجھے یقین تھا کہ وہ وزیر بننے کو اپنی زندگی کی معراج سمجھے گی۔ اس لئے اس سے بھی میں نے غیر رسمی طور پر دریافت نہ کیا کہ اسے وزارت قبول ہے یا نہیں۔

شام کو گورنر سے ملاقات ہوئی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ اصل موضوع پر پہلے میں گفتگو شروع کروں اور میں سمجھتا تھا۔ وہ خود مجھ سے درخواست کریں کہ میں حکومت مرتب کروں۔ گورنر نے میرا ارادہ بھانپتے ہوئے خود ہی اس باب میں آغاز گفتگو کیا۔

گورنر "مجھے بڑی خوشی ہے کہ اسمبلی میں آپ کی پارٹی تعداد کے لحاظ سے اتنی مضبوط ہے کہ شاید ہی کسی اور وزیر اعظم کو اتنی زبردست حمایت حاصل ہوئی ہو۔ آپ کا پروگرام کیا ہے؟"

میں نے مختصر الفاظ میں اپنا پروگرام اسے بتایا۔ اس نے دو ایک نکات کی وضاحت چاہی۔ وہ میں نے کردی۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے دو ٹوک پوچھا۔ کہ میں کن لوگوں کو وزیر بنانا چاہتا ہوں۔ میں نے کاغذ کا پرزہ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے عینک سنبھالی اور بڑے غور سے فہرست کو دو تین مرتبہ پڑھا اور پرزہ کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"اوشا کی عمر کیا ہے؟"

میں "یہی کوئی پچیس سال"

گورنر "آپ سمجھتے ہیں کہ وہ کامیاب وزیر ثابت ہوگی؟ ایک تو وہ عورت ہے دوسرے کم عمر۔ اس سوال پہ دوبارہ غور فرمائیے"

میں "موجودہ آئین نے نمائندہ حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا

ہے۔ اوشا صوبہ کی تمام شہری آبادی کی نمائندہ ہے۔ تمام شہری ممبر اس کی پارٹی میں شامل ہیں۔ کیا آپ کا یہ مقصد ہے کہ شہری نمائندگی کو وزارت سے یک قلم خارج کر دیا جائے؟ سوال یہ نہیں کہ اوشا کو وزارت میں نہ لینے سے پچاس ممبروں کی رائے سے میں وزارت سے محروم رہوں گا۔ بلکہ یہ کہ اس سے شہری آبادی میری وزارت سے بدگمان ہو جائے گی۔ وہ سمجھے گی کہ میری وزارت کی ابتدا ہی بے انصافی سے ہوئی ہے۔"

گورنر: "سابق وزیر اعظم بھی شہری ہے۔ اگرچہ اس کی پارٹی میں صرف دیہاتی ممبر شامل ہیں اور وہ بھی پندرہ اسے وزارت میں لے لیں تو وہ جلد ہی بہت سے دوسرے ممبروں کو جو اس وقت اس کی یا آپ کی پارٹی میں شامل نہیں۔ انہیں اپنے ساتھ ملا سکے گا۔ وہ یقیناً اوشا کی پارٹی میں سے بعض ممبروں کو کھینچ لائے گا۔ آپ جانتے ہیں اس کا تجربہ وسیع ہے۔ صوبہ کے انتظامی معاملات کو وہ خوب سمجھتا ہے۔ وہ آپ کے لئے بلاشبہ بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ آپ کی ہر دلعزیزی اور خلوص میں شک نہیں۔ لیکن صوبہ کا انتظام آپ کے لئے ایک نئی بات ہے میں مشورہ دیتا ہوں کہ سابقہ وزیر اعظم کو اوشا کی جگہ وزیر مقرر کر لو۔"

میں: "مجھے سابقہ وزیر اعظم کے تجربہ سے انکار نہیں میں چاہتا

ہوں کہ وہ اسمبلی میں میری حکومت کے خلاف بنچوں پر بیٹھے۔ اور اپنی پارٹی بنائے۔ وہ اپنے تجربہ سے کام لیتے ہوئے میری پالیسی پر نکتہ چینی کرتا رہے۔ تاکہ میں راہ راست سے بھٹکنے نہ پاؤں۔ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے۔ کہ جہاں وزیر اعظم کا قابل ہونا ضروری ہے۔ وہاں آپوزیشن کا لیڈر بھی بڑا قابل ہونا چاہیئے۔ تاکہ وزارت کو اپنے اختیارات بیجا طور پر استعمال کرنے کی جرأت نہ ہو۔ سابق وزیر اعظم کو وزارت میں لے لینے سے آپوزیشن قابل کی لیڈری سے محروم ہو جائے گی۔ اوشا اتنی پختہ کار نہیں کہ حکومت پر کڑی نکتہ چینی کر سکے۔ اور آپوزیشن کی لیڈر بن سکے۔ وہ وزارت میں رہ کر کام چلا سکے گی آپوزیشن کا کام زیادہ ذمہ داری کا ہے۔ اس سے وہ عہدہ برا نہیں ہو سکتی۔"

گورنر نے میرے ان الفاظ کے جواب میں کچھ نہ کہا صرف دو ایک مرتبہ غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور خاموش ہو رہا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ سابق وزیر اعظم کے لئے میری وزارت میں کوئی جگہ نہیں۔ اس نے میری فہرست سے اتفاق کرتے ہوئے مجھے یقین دلایا کہ آئینی لحاظ سے مجھے اس کا تعاون حاصل رہے گا اور جہاں تک ممکن ہوگا وہ مجھے مفید مشورہ دیں گے ملاقات کو ختم کرنے سے پہلے گورنر نے رسمی طور پر مجھ سے کہہ دیا کہ میں

اپنے وزیروں کے نام عوام میں ظاہر کردوں اور میرے اعلان کے بعد سرکاری گزٹ شائع ہو۔"

میں اپنے مکان پر واپس آیا تو پریس رپورٹروں اور فوٹوگرافروں کا ایک جمِ غفیر میرے دروازے پر موجود تھا۔ طرح طرح کے سوالات سے ان لوگوں نے مجھ سے بہت سی معلومات حاصل کرنی چاہیں۔ میں نے ان کے ہر سوال کا جواب دیا۔ لیکن جب وزیروں کے نام پوچھے گئے۔ تو میں نے کہہ دیا کہ ان کا اعلان کل کروں گا۔

ان لوگوں سے فارغ ہو کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ بطور وزیرِ اعظم کے اوشا کو رسمی خط لکھا

محترمہ اوشا دیوی

"آج شام کو میں نے گورنر کے مشورہ سے وزارت مرتب کرلی ہے۔ آپ شہری پارٹی کی لیڈر ہیں۔ میں نے آپ کو اپنی وزارت میں شامل کرلیا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ صوبہ کے معاملات میں میرا ہاتھ بٹائیں۔"

بشیر

سربمہر لفافہ میں نے اپنے نوکر کو دیا کہ وہ فوراً اوشا کو دے آئے گھنٹہ بھر کے بعد نوکر نے واپس آکر اوشا کی چھٹی میرے ہاتھ میں دے دی۔ میں نے چھٹی کھولی۔ لکھا تھا۔

محترم لبشیر

"میں آپ کی درخواست کو رد کرتی ہوں۔ مجھے وزیر بننا منظور نہیں۔"

ادشا

تدبیر اور تقدیر

ادشا کا خط پڑھ کر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اور یوں محسوس ہوا کہ مجھ پر بجلی گر پڑی ہے۔ میری جگہ کوئی اور سیاستدان ہوتا تو ادشا کو نظر انداز کر کے شہری نمائندگی کے بغیر ہی وزارت مرتب کر لیتا یا سابق وزیر اعظم کو ادشا کی جگہ چن لیتا جس سے شہری نمائندگی بھی قائم رہتی اور گورنر بھی خوش ہو جاتا۔ لیکن میرے لئے یہ ممکن نہ تھا۔ وہ لبشیر! جس میں خوشامد۔ جانب داری اور مصلحت بینی کا مادا تھا۔ اسے میں نے جیل میں مار دیا تھا۔ جو لبشیر اب وزیر اعظم تھا۔ وہ دیانت داری کا مجسمہ اور خدائی حکومت کو دنیا میں قائم کرنے کا ذمہ دار تھا۔ اس لئے اس کے واسطے ممکن نہ تھا کہ شہری آبادی کی صحیح نمائندگی کو پس پشت ڈال دیتا۔ اس کے حلقہ میں پرانے وزیر اعظم کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کی

وزارت میں شہری جانب سے صرف اُوشا کے لئے جگہ تھی جب تک اوشا کی شہری لیڈری قائم تھی۔ بشیر اس کے بغیر وزارت کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ یہ بات اب اس کے ذہن سے بالکل محو ہو چکی تھی کہ اوشا نے کبھی اس کی توہین کی تھی۔ اور اس کے لئے سخت سے سخت الفاظ استعمال کئے تھے۔

مجھے یہ کہہ دینے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ اوشا کا خط پڑھ کر چند لمحوں کے لئے میرے اعصاب معطل ہو گئے۔ اس کی زیادہ وجہ یہ تھی کہ میرا وزارت کا خواب ایک خواب پریشاں ثابت ہوتا نظر آ رہا تھا۔ حاصل ہونے والے وقار۔ طاقت۔ منصب کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر بے حد افسوس ہوا۔ دل ہی دل میں قسمت کی شکایت بھی کی۔ لبِ بام پہنچ کر کمند ٹوٹتی ہوئی نظر آئی۔ زیادہ صحیح لفظوں میں یہ کہ اپنی تمام کمزوریوں کے ساتھ میں ایکدفعہ پھر وہی پرانا بشیر تھا۔ لیکن ان لمحات کی عمر بالکل مختصر اور ناپائیدار ثابت ہوئی۔ میں نے جلد ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ میں اب پھر نیا بشیر تھا۔ وہ بشیر جس کا پہلے بشیر کی کمزوریوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔

میں نے اوشا کے خط پر دوبارہ نگاہ ڈالی اور مسکرا کر اسے ایک طرف رکھ دیا۔ میرے دل میں افسوس کا شائبہ تک نہ تھا میں پوری طرح مطمئن تھا۔ ضمیر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا تم

نے حالات کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی کسی بات میں تمہاری ذاتی خواہش کی جھلک تک نہ تھی۔ انسان کا کام کوشش میں اپنی پوری طاقت صرف کر دینا ہے۔ وہ تم نے کر دی۔ خدا نے تمہاری ہر سعی کو مشکور کیا۔ اور بے شمار موقعوں پر کامیابی دے کر اس نے تمہیں صورت حال تک پہنچایا۔ اگر اب تمہاری وزارت کا جہاز کسی مخالفت کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتا ہے۔ اور تم مجبور ہو تو معاملہ خدا پر چھوڑ دو۔ ساری دنیا وزیر اعظم نہیں اگر تمہارا کردار بلند اور تمہاری رگوں میں صداقت کی حرارت ہے تو تم ہر حالت وزیر اعظم ہو۔ دنیا تمہیں وزیر اعظم تسلیم کرے یا نہ کرے میں تمہیں وزیر اعظم ہی سمجھوں گا۔

میں نے اس باب میں کسی سے مشورہ کرنا فضول سمجھا اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں شہری آبادی کا تعاون حاصل نہیں کر سکتا تو مجھے وزارت چھوڑ دینی چاہیئے۔ ایسی وزارت کا کیا فائدہ۔ جس کی ابتدا ہی بے انصافی سے ہو پھر خیال آیا کہ میرے بعد دیہاتی ممبروں میں کوئی آدمی ایسا موجود نہیں جو وزارت کا بوجھ اٹھا سکے نتیجہ یہی ہوگا کہ سابق وزیر اعظم جوڑ توڑ کر کے پھر وزیر اعظم بن جائیگا اور صوبہ کا انتظام پھر وہی ہوگا۔ جو پہلے تھا۔ میرے تمام کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ اس خیال سے میرے دل کو بہت تکلیف ہوئی۔ مگر میں نے وزارت سے دستبردار رہنے کا فیصلہ بحال

رکھا۔

میں گورنمنٹ ہاؤس سے واپس آ کر ابھی تک شیریں سے نہیں ملا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ٹیلیفون پر شیریں سے ساری سرگزشت کہہ دوں میں نے ٹیلیفون اٹھایا اور ریلا کم وکاست ساری آپ بیتی کہہ دی۔ یہ سب کچھ سن کر شیریں نے کہا۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ تم اوشا کی بجائے کسی اور شہری ممبر کو وزیر بنا لو"

میں "نہیں یہ ممکن نہیں۔ اگر شہری ممبر کسی اور آدمی کو اپنا لیڈر چن لیں یا وہ خود یہ فیصلہ کر دیں کہ اوشا کی بجائے ان میں سے کسی اور کو وزارت میں لے لیا جائے تو میں بڑی خوشی سے کسی دوسرے شہری ممبر کو وزارت پیش کر دوں گا۔ لیکن صورت یہ ہے کہ سارے کے سارے شہری ممبر اوشا ہی کو وزیر دیکھنا چاہتے ہیں"

شیریں "پھر!"

میں "پھر کیا۔ اوشا وزارت قبول نہیں کرتی۔ اس کے بغیر وزارت مرتب نہیں ہو سکتی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ گورنر سے کہہ دوں میں وزیر اعظم نہیں بننا چاہتا"

شیریں۔ اس وقت آپ کو افسوس نہ ہوگا؟ بعد میں آپ پچھتا تو نہ جائیں گے نہیں؟"

میں "میں بالکل نہیں پچھتاؤں گا۔ میں ہر حالت میں مطمئن ہوں"

شیریں :" فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کیجئے۔ خود سوچئے مجھے سوچنے کا موقع دیجئے۔ ممکن ہے کوئی امید افزا صورت پیدا ہو جائے"
میں :" مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ میں دو ایک دن انتظار کروں گا۔"
شیریں :" اوشا نے کیوں انکار کیا؟"
میں :" مجھے اس کا علم نہیں شاید اسے مجھ سے نفرت ہے"؟
شیریں :" نفرت؟ بھولے بشیر! تم مرد ہو اور صرف مردوں کی فطرت کو سمجھ سکتے ہو۔"
میں :" آپ کا یہ فقرہ میرے لئے ایک پہیلی ہے۔ اس کی وضاحت کیجئے۔"
شیریں :" بشیر تم میرے ہو۔ یہ بھولنا نہیں۔ میں تمہیں وزیر اعظم دیکھنے کی متمنی ہوں۔ بلکہ خدا تمہیں اس سے بھی بڑا بنائے میں ہمیشہ بڑی خوش قسمت رہی ہوں۔ کیا اب میری قسمت میرا ساتھ چھوڑ دیگی؟"
میں :" شیریں یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو ہماری شادی کی تاریخ قریب آ رہی ہے۔ تم ہو کہ بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔ تمہاری خود اعتمادی کو کیا ہوا؟"
شیریں :" مجھے معاف کر دو۔ میں اپنے آپ میں نہ تھی۔"
شیریں کی گفتگو نے مجھے اور الجھن میں میں ڈال دیا۔ مجھے سخت حیرانی ہوئی کہ آخر میری طرف سے اسے اطمینان کیوں نہیں

آج اس نے کیوں بہکی بہکی باتیں کیں۔ شادی کی تاریخ مقرر ہو جانے پر تو کم از کم اس کی تسلی ہو جانی چاہئے تھی۔ میں نے اس معاملہ پر بہت غور کیا۔ لیکن کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔

یکایک مجھے خیال آیا۔ کہ مجھے وزارت تو بہرحال چھوڑنی ہے آج نہ چھوڑی دو دن بعد چھوڑ دوں گا۔ کیوں نہ اوشا سے مل کر اس کی ضد اور ہٹ کی وجہ دریافت کر لی جائے۔ ممکن ہے اسے شبہ ہو کہ میں اس کی وزارت میں موجود ہونے کے باوجود شہری حقوق کی حفاظت نہیں کر سکوں گا۔ میں وزارت اس لئے مرتب کر رہا ہوں کہ صوبہ کا بھلا ہو۔ اگر اوشا سے ملاقات کرنے سے کوئی امید افزا صورت پیدا ہو جائے تو اوشا صوبہ کی بہت بڑی محسنہ ہو گی۔ میں نے رانی باغ میں منعقدہ کانفرنس میں اوشا کو آخری بار دیکھا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ نہ اس سے ملاقات ہوئی اور نہ دل نے اس سے ملنے کی تحریک کی۔ جہاں تک میری توہین کا سوال تھا۔ جو اس نے رانی باغ میں کانفرنس کے سٹیج پر کی تھی۔ اس کا تعلق پہلے بشیر سے تھا۔ میرا اوشا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نہ اس سے دوستی تھی۔ نہ دشمنی۔

میں نے دوبارہ ٹیلیفون اٹھایا اور چند سیکنڈ میں اوشا سے مخاطب تھا۔

میں "اوشا! مجھے تمہارا جواب مل گیا۔ میں تم سے دو بدو باتیں کرنا چاہتا ہوں"۔

اوشا: مجھے امید تھی کہ آپ مجھے ٹیلیفون کریں گے۔ کہئے کیا ارشاد ہے۔ میں حاضر ہوں۔"

میں: "تمہیں یہ معلوم ہے کہ میں کس موضوع پر تم سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔ کیا اس وقت آپ فارغ ہیں۔ میں ابھی آسکتا ہوں۔"

اوشا: "اوشا لاکھ بدتمیز سہی۔ حفظِ مراتب سے لاعلم نہیں۔ خدا نے تمہیں بڑائی دی ہے۔ اب میرا فرض ہے کہ خود آکر تمہاری بات سنوں۔ تمہیں میرے ہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں آدھ گھنٹے تک تمہارے مکان پر پہنچ جاؤں گی۔"

میں نے اسے روکنے کی کوشش کی کہ وہ خود میرے مکان پر نہ آئے۔ لیکن اس نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ اور میرے الفاظ ہوا میں منتشر ہو کر رہ گئے۔

گہری شام ہو چکی تھی۔ میں اوشا سے ہونے والی ملاقات پر غور کرنے لگا۔ اوشا کی صحبت میں گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ اوشا ہمیشہ سلیقہ شعار۔ خوش مزاج اور تہذیب یافتہ لڑکی تھی۔ مجھے اس میں کبھی کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی تھی۔ جو ناگوار گزرتی۔ کانفرنس کی سٹیج پر میرے خلاف اس کا غیظ و غضب پہلا اور آخری ثبوت اس بات کا تھا کہ اوشا بھی دیگر انسانوں کی طرح اخلاق کی عام سطح تک نیچے اتر سکتی ہے۔ اس

سے قبل وہ ایک دیوی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا اوشا کی خوش اخلاقی خدمتِ وطن کا جذبہ اور جوشِ خلوص صرف اپنے خاندان کا سیاسی وقار قائم رکھنے کی غرض سے تھا۔ اور اصلیت وہ تھی جس کا اظہار کانفرنس کے سٹیج پر ہوا۔ یا اوشا کا اصل کیریکٹر وہی تھا جس نے مجھے اس کا سخت شیدائی بنا دیا تھا۔ اور کانفرنس والا واقعہ محض ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ میں جوں جوں اس سوال پر غور کرتا۔ معاملہ زیادہ پیچیدگی اختیار کرتا جاتا۔ آخر میں نے سوچا کہ مجھے اس معاملہ کی تہ میں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرا اوشا سے کوئی تعلق نہیں جس اوشا کے اخلاق پر میں تنقید کر رہا ہوں۔ وہ پرانے بشیر کے ساتھ ہی رخصت ہوئی۔ نئے بشیر کا ملاقات کے لئے آنے والی اوشا سے صرف اس حد تک تعلق ہے کہ وزارت کے سلسلہ میں اس سے گفتگو کی جائے اور بس۔

اوشا نے آدھ گھنٹہ تک میرے مکان پر پہنچنے کا وعدہ کیا تھا دو گھنٹے گزر گئے۔ وہ نہ آئی۔ کھانے کا وقت گزر رہا تھا۔ میں کھانے پر بیٹھنے کے لئے اٹھا ہی تھا۔ کہ موٹر کا ہارن سنائی دیا۔ میں باہر گیا۔ اوشا اپنی موٹر کار سے اتر رہی تھی۔ میں نے اس کا استقبال کیا اور اسے اپنے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

میں زمیندار ہوں۔ دوسرے دیہاتی لوگوں کی طرح میں بھی ذرا پھیل کر بیٹھنے کا عادی ہوں۔ کلرکی کے زمانہ میں بھی میں کرسی پر اس طرح

بیٹھتا تھا کہ کرسی کے دونوں بازو میری بغلوں میں ہوتے تھے۔ اس وقت اپنے لئے ایک لمبا صوفہ بیٹھنے کے لئے تجویز کیا تاکہ حسب عادت بے تکلف ہو کر بیٹھ سکوں۔ اور صوفہ کے سامنے ایک شاندار کرسی پر ادشا کو بٹھانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ادشا سے کہا۔

"تشریف رکھئے۔"

اور خود صوفہ پر بیٹھنے لگا۔ ادشا میرے اشارہ کی پروا نہ کرتے ہوئے آگے بڑھی اور صوفہ پر ایک طرف بیٹھ گئی۔ میں صوفہ کے ایک گوشہ میں دبک گیا۔ ادشا کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تو آنکھوں میں چکا چوند ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ فردوس بریں سے کوئی حور ادشا کے روپ میں آ گئی ہے۔ حسن کامل کی جھلک اور اس پر لباس کا خاص انتخاب بس یہ سمجھئے کہ دنیا کی تمام دلفریبیاں اور رعنائیاں اس ایک وجود میں سمٹ آئی تھیں۔ پرانے بشیر کا خرمن ہوش و حواس اس بجلی کی زد میں آ کر ہرگز محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن نئے بشیر سے یہ برابر کی ٹکر تھی۔ دو منٹ تک مکمل سکوت تھا۔ ہم ایک دوسرے سے نظر بچا کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ آخر میں نے لب کشائی کی۔

ادشا تم نے میری وزارت میں شامل ہونے سے کیوں انکار کر دیا؟

ادشا "مجھے وزارت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں وزیر بننا نہیں چاہتی"

میں "ادشا! تم یہ بات اپنے خط میں بھی لکھ چکی ہو۔ تمہارے

اس ارشاد سے میرے اس مقصد کو کوئی تقویت نہیں پہنچتی۔ تم خود وزیر بننا نہیں چاہتی تو اپنی پارٹی کے کسی دوسرے آدمی کا نام تجویز کر دو۔ تا کہ میں اسے وزارت پیش کرسکوں۔"

ارشاد "میری موجودگی میں میری پارٹی کا کوئی دوسرا ممبر وزارت قبول کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

میں "یہ عجیب الجھن ہے۔ تمہیں وزارت سے کوئی دلچسپی نہیں تمہاری پارٹی کا کوئی دوسرا ممبر وزارت قبول کرنے کی جرأت نہیں کریگا اور میں تمہاری پارٹی میں سے ایک ممبر کو وزیر بنائے بغیر اپنی وزارت مرتب نہیں کرسکتا۔ آخر اس معمہ کا حل کیا ہے؟"

ارشاد "تم میری پارٹی کا تعاون حاصل کئے بغیر اپنی وزارت مرتب کرلو۔"

میں "یہ ممکن نہیں۔"

ارشاد "اگر میری پارٹی کسی صورت میں آپ سے اشتراک عمل نہ کرے تو نتیجہ کیا ہوگا؟"

میں "میں وزارت مرتب نہیں کروں گا۔ میں اس صورت میں وزیر اعظم نہیں بن سکتا۔ ارشاد! میں گورنر سے مل چکا ہوں ——— ——— میں اسے بتا چکا ہوں کہ کون کون میری وزارت میں شامل ہیں۔ یہ میری غلطی تھی کہ تم سے پوچھے بغیر میں نے تمہارا نام اپنی فہرست میں شامل کرلیا۔ اگر مجھے پہلے علم ہوتا کہ میں شہری ممبروں کو اپنے ساتھ

نہیں ملا سکوں گا۔ تو میں ہرگز ہرگز وزارت مرتب نہ کرتا۔ تمہارے انکار نے مجھے دلدل میں پھنسا دیا ہے۔ جس سے سلامت نکل سکنا نظر نہیں آتا۔"

میں نے دیکھا کہ اوشا کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ اور اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

اوشا "آپ سمجھتے ہیں کہ صورت حال اتفاقیہ پیدا ہو گئی ہے؟"

میں "ساری پیچیدگی کے پس پردہ کارفرما صورت حال کا مجھے علم نہیں۔ صرف اتنا جانتا ہوں۔ اس معاملہ کے جس حصہ نے وزارت کی کشتی کو بھنور میں ڈال رکھا ہے۔ وہ تمہارا پیدا کردہ ہے کیا تم میری مدد نہیں کروگی؟"

اوشا "میں تمہارا معمہ حل کر دیتی ہوں۔ میں تجویز کرتی ہوں۔ کہ تم شیریں کو میری جگہ وزیر بنا دو۔ میری ساری پارٹی اس کی تائید کریگی یہ میرا ذمہ رہا۔"

میں "شیریں میری ہونے والی بیوی ہے۔ وہ اسمبلی کی ممبر نہیں۔ نہ اسے سیاسی باتوں سے زیادہ دلچسپی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک ہونے والی اچھی بیوی سیاستدان بھی ہو۔ جب وہ اسمبلی کی ممبر نہیں تو میں اسے وزیر کیسے بنا سکتا ہوں؟"

اوشا۔" میں اپنی ممبری سے استعفیٰ دینے کو تیار ہوں۔ وہ میرے ہی حلقہ سے ممبر منتخب ہو سکتی ہے۔"

میں۔" ادشا۔"

ادشا۔" جی۔"

میں "آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟ تم کیوں بے معنی باتیں کرنے لگی ہو؟"
ادشا نے اپنی ساڑھی کا پلو دیوانہ وار اپنی انگلیوں سے ملتے ہوئے کہا
"بشیر! مجھے صوبہ کی وزارت نہیں چاہیئے۔ میں گھر کی وزارت چاہتی
ہوں۔ مجھے اپنے گھر کی وزارت دیدو۔"

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر نہ کہہ سکی۔ اس نے التجا آمیز نگاہوں سے
بے اختیار میری طرف دیکھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے پر تھیں۔

"ادشا میں اپنی شادی کا معاملہ شیریں سے طے کر چکا ہوں۔ ہماری
شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ اگر میری شادی طے نہ ہو چکی ہوتی۔ تو
بھی شاید اپنے آپ کو میں تمہارے قابل نہ سمجھتا۔ لیکن اب سمجھنے یا نہ
سمجھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

ادشا۔" شیریں سے شادی کر کے تم وزیر اعظم نہیں بن سکتے میری
پارٹی تمہارا ساتھ نہیں دیگی۔ اور شیریں کو اگر تم سے ذرا بھی محبت
ہے تو وہ کبھی گوارہ نہیں کرے گی کہ اس کی وجہ سے تم وزارت کھو
بیٹھو۔ پس اگر تم شیریں سے شادی کرو تو تمہاری وزارت گئی اور شیریں
یہ گوارہ نہیں کرے گی۔ کہ تم وزارت سے محروم رہو۔ اس طرح تمہارا
معاملہ زیادہ پیچیدہ ہو جائے گا۔ تمہیں اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنی ہی
ہوگی۔"

میں :۔ "اوشا! مجھے وزارت کی پرواہ نہیں تم میرے گھر کے معاملہ میں دخل نہ دو میرا اور شیریں کا معاملہ ایک جدا معاملہ ہے تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ کیا تم مجھ سے توقع رکھتی ہو کہ میں تم سے سول میرج کروں؟ میں عدالت میں جا کر اعلان کردوں کہ میرا کوئی مذہب نہیں؟ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ دوں کہ میرا کوئی خدا نہیں؟ تم سے شادی کرنے کا یہ مطلب ہے کہ بر سر عدالت کہہ دوں خدا کوئی نہیں بشیر سے اور اس بات کی توقع؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے"؟

اوشا۔ "بشیر! تم وہ بشیر نہیں ہو جو پہلے تھے۔ تم بدل گئے ہو"؟

میں۔ "تمہارا خیال بالکل صحیح ہے۔ میں پہلا بشیر نہیں ہوں"؟

اوشا "مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ میری بیوقوفی، میری قسمت۔ کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گے۔ میں نے تمہاری سخت توہین کی تھی۔ مجھے اس پر ندامت ہے"۔

میں۔ "جس توہین کا تم ذکر کر رہی ہو اس کی یاد تک میرے یعنی اس بشیر کے ذہن میں باقی نہیں جس سے تم مخاطب ہو"۔

اوشا۔ "پھر"؟

میں۔ "پھر یہی کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ میری بیوی شیریں ہی بن سکتی ہے"۔

اوشا:۔ "تم نے ایک دفعہ مجھ سے کہا تھا تمہیں مجھ سے محبت ہے"۔

میں:۔ "خود تم نے مجھے دھتکار دیا۔ زیادتی میری طرف سے نہیں ہوئی"۔

اوشا۔ "میری اس بیوقوفی سے محبت کا عہد میری طرف سے ٹوٹا۔ تم نے اپنا وعدہ واپس نہیں لیا۔ وعدہ کرنے والی دو پارٹیوں سے اگر ایک

پارٹی وعدہ توڑ دے تو ضروری نہیں کہ دوسری پارٹی کی طرف سے بھی وہ ٹوٹ جائے قانوناً ممکن ہے اسے ٹوٹا ہوا سمجھ لیا جائے لیکن اخلاقاً وہ وعدہ خود بخود ہی نہیں ٹوٹ جاتا اب جبکہ میں اپنی غلطی کی معافی چاہتی ہوں آپ کا وعدہ کو توڑنا مناسب نہیں"۔

میں ۔"اوشا مجھے وزارت نہیں چاہیئے ۔میں کل گورنر سے کہہ دونگا کہ وہ کسی اور کو وزیر اعظم بننے کی دعوت دے میں اس کا اہل نہیں"

اوشا ۔" تم اپنی مرضی کے مالک ہو میرا مشورہ ہے کہ تم جلد بازی سے کام نہ لو"۔

میں ۔"تمہارے مشورہ کا شکریہ ۔میرا فیصلہ بہرحال میرا فیصلہ ہے

اوشا ۔" بالکل اسی طرح جیسے میرا فیصلہ بہرحال میرا فیصلہ ہے"۔

دو منٹ تک بالکل خاموشی رہی ۔مجھے جو کچھ کہنا تھا میں کہہ چکا۔ اوشا نے صاف جواب دے دیا ۔اب گفتگو کو جاری رکھنے کے لئے کوئی دوسرا موضوع نہ تھا ۔اوشا نے بھی یہ محسوس کیا۔ وہ آہستہ سے اٹھی اس کے چہرہ پر غم کے گہرے آثار تھے ۔میں نے دیکھا کہ اسے اپنے پاؤں پر قابو نہیں ۔اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے ۔ وہ بصد مشکل چل رہی تھی ۔میں اس کے ہمراہ تھا۔ وہ موٹر میں بیٹھ گئی تو میں نے اسے شب بخیر کہا ۔اس نے کوئی جواب نہ دیا ۔

شیریں کی ضد

رات کو سونے سے قبل میں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ میں وزیر اعظم نہیں بنوں گا۔ گورنر کو اطلاع کر دوں گا کہ میں وزارت بنانے کا اہل نہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنے اس فیصلہ پر بالکل افسوس نہیں ہوا۔ بلکہ دل پر سے ایک بوجھ سا اٹھ گیا۔ میں خوب گہری نیند سویا۔ صبح اٹھا تو بالکل تازہ دم تھا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب میں نے شیریں کو ٹیلیفون کیا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ آج شام کے پانچ بجے گورنر سے مل کر میں اپنی اس وزارت کا استعفی دینے کا فیصلہ کر چکا ہوں جس کا ابھی باقاعدہ اعلان بھی نہیں ہوا۔ پھر میں نے اسے اوشا سے ملاقات کا سارا واقعہ سنایا۔ صرف وہ حصہ اسے بتانے کی ضرورت نہ سمجھی جس میں خود شیریں کا نام آتا تھا۔ شیریں مجھ سے دو اڑھائی میل کے فاصلہ پر تھی۔ گفتگو ٹیلیفون پر ہو رہی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا اس گفتگو کے دوران میں اس کے چہرہ پر کیا تاثرات تھے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کی آواز میں اضطراب اور لہجہ میں ایک خاص قسم کی لکنت تھی جس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ اس وقت دلی کشمکش کے شدید ترین عذاب سے دوچار ہے۔ میری گفتگو سننے کے بعد شیریں نے کہا۔

"مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں کہ میری وجہ سے آپ وزیر اعظم نہ بنیں۔ اور اس طرح تمام صوبہ اپنے بہترین لیڈر کی قابلیت سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ سے دُور رہ کر میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ دنیا بھر میں مشہور ہو چکا ہے کہ میری آپ سے شادی ہونے والی ہے۔ آپ سے میری شادی نہ ہونے پر میں اور میرے بزرگ کسی کو منہ نہیں دکھا سکیں گے لیکن یہ سب رواج اور رسم کی باتیں ہیں۔ اس کے مقابلے میں صوبہ بھر کی حالت سدھر جائیگی۔ آپ اوشا سے شادی کر لیں۔"

میں۔ "شبریں! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں اوشا سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں نے اسے صاف جواب دے دیا ہے۔ مجھے وزارت کی ضرورت نہیں آپ میرے راستہ میں خواہ مخواہ روڑے نہ اٹکائیں۔"

شبریں "میں آپ کے راستہ میں روڑے نہیں اٹکاتی۔ لیکن جس شادی کی ابتدا وزارت سے محرومی سے ہو اس کا انجام کیا ہو گا! اگر آپ نے وزارت سے استعفیٰ دیدیا تو میں آپ سے ہرگز ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ ہماری شادی میں آخر میری رضامندی کو بھی دخل ہے۔ اگر میں نہ چاہوں تو آپ مجھ سے کیسے شادی کر سکتے ہیں"؟

میں "آپ نے یہ ایک نئی پیچیدگی پیدا کر دی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ آپ سے شادی کروں تو وزارت سے محروم رہتا ہوں۔ آپ شادی کے لئے یہ شرط مقرر کرتی ہیں کہ میں وزیر اعظم ضرور رہوں۔ اور وزیر اعظم بننے

کے لیئے اوشا کی مدد درکار ہے۔ اوشا مدد کرنے سے صاف انکاری ہے
اب آپ ہی بتائیں مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

میرے اور شیریں کے درمیان دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ نہ وہ مجھے قائل کر سکی نہ میں اسے رضامند کر سکا۔ آخر میں نے اپنا فیصلہ دیدیا کہ میں پانچ بجے شام گورنر سے مل کر وزارت سے پیچھا چھڑالوں گا۔ شیریں بہت سٹپٹائی۔ لیکن مجھے بضد دیکھ کر اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ میں گورنر سے ملاقات کو جاتے وقت اس کے ہاں سے ہو کر جاؤں۔ میں نے وعدہ کر لیا کہ میں ساڑھے چار بجے اس کے مکان پہ پہنچ جاؤں گا۔

گیارہ بجے کے قریب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو اوشا بول رہی تھی۔ اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

"شیریں اس وقت میرے مکان پر ہے۔ اس نے میرے سامنے قسم کھائی ہے کہ وہ آپ کو وزارت سے استعفیٰ نہیں دینے دیگی۔ اور اگر آپ نے استعفیٰ دیدیا تو وہ آپ سے شادی نہیں کریگی۔ یہ میری دوسری کامیابی ہے۔ پہلی کامیابی یہ تھی کہ آپ کو مجبور کر دیا آپ مجھ سے مدد طلب کریں"۔

میں نے "آپ کی کامیابیاں بجا ہیں۔ لیکن یہ کامیابیاں مجھے آپ سے بہت دور لے جا رہی ہیں۔ میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ شیریں کو چھوڑ کر آپ سے شادی نہیں کروں گا۔ پھر آپ کا مجھے اس طرح تنگ کرنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک منٹ کیلئے فرض کر لیجئے کہ میں وزیر اعظم نہیں بنتا اور شیریں بھی

مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ میں آپ سے شادی کروں گا۔ آپ کی موجودہ کاروائیاں میرے دل میں آپ کے خلاف نفرت پیدا کر رہی ہیں"۔

میں نے اوشا سے کہا کہ وہ شیریں کو ٹیلیفون پہ بلا دے۔ لیکن اوشا نہ مانی۔

دو نہیں بلکہ تین لاشیں

شام کے چار بجے میں کپڑے پہن کر تیار ہو گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ اپنے مکان سے نکلکر سیدھا شیریں کے ہاں جاؤں گا۔ وہاں چند منٹ ٹھہر کر گورنمنٹ ہاؤس میں گورنر سے ملاقات ہو گی۔ موٹر کار تیار رکھی۔ میں اپنے ڈرائنگ روم سے باہر آ کر برآمدہ تک آیا تھا کہ ایک موٹر میرے مکان کے احاطہ میں داخل ہوا۔ میں نے فوراً پہچان لیا یہ اوشا کا موٹر تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ اوشا کا خود بخود میرے مکان پہ چلے آنا خالی از علت نہیں۔ ضرور اس نے کوئی نیا منصوبہ سوچا ہو گا۔ میں جہاں تھا وہیں کا وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔ اتنے میں دیکھا کہ موٹر میں سے دو لڑکیاں برآمد ہوئیں۔ ایک اوشا تھی۔ دوسری شیریں۔ یا مظہر العجائب یہ کیا گل کھلنے والا ہے۔ اوشا نے جو ڈرامہ شروع کر رکھا ہے وہ کب

ختم ہوگا؟ اب کونسا سین دکھانے والی ہے؟

شیریں اور اوشا موٹر سے اتر کر میری طرف آرہی تھیں۔ شیریں کے چہرہ پر وقار آمیز اطمینان تھا۔ اس کی نظریں بار بار میری طرف اٹھ رہی تھیں۔ اس کے برعکس اوشا چھوئی موئی بنے نظریں جھکائے چلی آرہی تھی۔ اس کا چہرہ کبھی سرخ نظر آتا کبھی زرد۔ خدا جانے اس کی دلی کیفیت ہر لحظہ بدل رہی تھی یا میری آنکھوں نے دھوکا کھایا۔ بہر حال اس وقت انداز و ادا کے لحاظ سے شیریں اوشا معلوم ہو رہی تھی اور اوشا شیریں نظر آرہی تھی۔ میں انہیں ڈرائننگ روم میں لے گیا جب ہم بیٹھ گئے تو میں نے اوشا کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی آنکھیں جھکائے بیٹھی تھی مجھے توقع تھی کہ اوشا کوئی لمبی چوڑی تقریر کریگی اور اپنی آمد کی غرض و غائت بتائیگی۔ لیکن وہ بالکل خاموش رہی۔ شیریں نے مجھسے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہم نے آپ کی مشکل حل کر دی ہے۔ آپ کو وزارت سے استعفیٰ دینے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں آپ کو مبارکباد دیتی ہوں"

میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اوشا کی طرف دیکھا۔ اس نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا اور پھر آنکھیں نیچی کرلیں۔ میں نے شیریں سے کہا۔

"مجھے یقین تھا کہ اوشا کو اپنی غلطی محسوس ہو جائیگی اور وہ اپنی ضد چھوڑ دیگی۔ میں خوش ہوں کہ میرا قیاس صحیح ثابت ہوا۔ اور اوشا کو

سمجھ آگئی ۔ مجھے پوری سرگزشت سنائیے آخر آپ نے اوشا کو کیسے منایا میرے منانے سے تو یہ نہیں مانی تھی"۔

شیریں "اوشا کو آپ سے بیحد محبّت ہے ۔ وہ آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی ۔ مجھے آپ سے اور بھی زیادہ محبت ہے میری زندگی بھی آپ کے بغیر ممکن نہیں ۔ آپ کی مجبوری بھی ظاہر ہے۔ اس ساری صورت حال پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد ہم دونوں نے خود کشی کر لینے کا فیصلہ کیا ہے"۔

شیریں کی زبان سے خودکشی کا لفظ سن کر میرا دل بیٹھ گیا۔ میں نے انتہائی کرب کی حالت میں کہا ۔

"آپ میرے لئے یہی خوشخبری لیکر آئی ہیں ؟ خدا آپ دونو کو ہدایت دے ۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ؟ خودکشی کی تجویز ضرور اوشا نے پیش کی ہوگی"۔

شیریں: "نہیں ۔ یہ میری تجویز ہے ۔ اوشا نے مجھ سے صرف اتفاق رائے کیا ہے"۔

میں: "آپ نے خودکشی کا فیصلہ مجھے وزارت دلانے کی غرض سے کیا ہے ۔ میں ایسی وزارت کا نام بھی سننے کو تیار نہیں جس سے انسانی خون کی بو آتی ہو"۔

شیریں: "میرے پیارے بشیر! یہ بات نہیں ۔ ہم دونوں مل کر آپ کے دوش بدوش خدمت خلق کرنا چاہتی ہیں ۔ ہم نے فیصلہ

کیا ہے کہ دنیا کے رواج اور اپنی ذاتی خواہشات کا گلا گھونٹ کر اپنی زندگیوں کو صرف سچائی اور خدمت خلق کیلئے وقف کر دیں ایسی زندگی آسان زندگی نہیں۔ اس طرح گویا اپنے آپ پر روزانہ ایک نئی موت وارد کرنا ہے۔ مگر ہم اس آزمائش پر پوری اُتریں گی۔ ہم دونوں آپ سے شادی کریں گی اور ایک ہی وقت کریں گی"۔

مَیں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر شیریں نے اپنی گفتگو ختم کی ہی تھی کہ اوشا نے بولنا شروع کر دیا:

"بشیر! یہ عملی زندگی ہے۔ اس میں قدم قدم پر انسان کو ٹھوس حقائق سے پالا پڑتا ہے۔ آپ کوئی ناول نہیں لکھ سکتے کہ محبت سے محبت کرنے والی دو لڑکیوں میں سے ایک کو آپ یک جنبش قلم زہر کھانی دکھائیں یا اس کا گلا گھونٹ دیں تاکہ دوسری لڑکی سے شادی کر کے بہرہ آرام کی زندگی بسر کر سکے۔ یہ ناٹک نہیں۔ بلکہ عملی زندگی ہے۔ اس میں نہ میں مرنا چاہتی ہوں اور نہ شیریں موت کے گھاٹ اترنا چاہتی ہے کسی حد تک ہم قربانی ضرور کر سکتی ہیں۔ اور وہ یہی ہے کہ میں شیریں کو برداشت کروں اور شیریں مجھے برداشت کرے۔ ہم دونوں آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہیں اور اس کی یہی صورت ہے کہ ہم دونوں آپ سے شادی کر لیں۔ میں آپ سے سول میرج نہیں کروں گی۔ بلکہ آپ کے طریقہ پر شادی ہوگی۔ میری پارٹی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں"۔

شیریں نے مسکرا کر قدرے مزاحیہ انداز سے کہا "آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم

خودکشی کرنے کی ترکیب سوچ رہی ہیں۔ ہم خودکشی کرنے کے لئے آپ کے پاس آئی ہیں۔ اس وقت ہم دو لاشیں آپ کے سامنے کھڑی ہیں"

مجھ پہ عجیب کیفیت طاری تھی۔ سامنے کی دیوار پہ ٹکٹکی باندھے میں صرف اتنا کہہ سکا۔

"شہریں! یہاں دو نہیں بلکہ تین لاشیں ہیں۔ میں آپ دونوں سے بہت پہلے خودکشی کر چکا ہوں"۔

شہریں اور ارشا دونوں بےخود ہوکر میری طرف بڑھیں۔ شہریں مجھ سے لپٹ گئی اور ارشا میرے پاؤں چھونے کیلئے جھکی۔ میں نے اسے اٹھا کر صوفہ پر اپنے برابر بٹھا لیا۔ ہم تینوں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری تھے۔

ایک ہسپتال کا معائنہ

جب میں نے جیل میں خودکشی کی تو پہلے کے تمام واقعات کو بھلا دیا۔ اس سے ثریا بھی ہمیشہ کیلئے میرے یعنی بشیر کے ذہن سے رخصت ہوگئی۔ لیکن یہ انکشاف کہ ثریا نے دو انسانی جانیں لینے کی کوشش کی اور ایک جان درحقیقت لے لی میری زندگی

کے دور میں ہوا۔ اب جبکہ میں پورا منصف اور ایماندار تھا۔ میرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ کسی کا جرم ثابت ہو جانے پر اس کے متعلق خاموش رہوں۔ ثریا سے اب مجھے کوئی ذاتی رنجش نہ تھی۔ صرف اس کا جرم مقتضی تھا کہ اسے عدالت میں لایا جائے اور قانون کے مطابق اسے سزا دی جائے۔ ثریا شیریں کی بھاوج تھی۔ شیریں میری رفیقۂ حیات تھی۔ مجھے شیریں کا بہت پاس تھا۔ لیکن اس پاس کا یہ مطلب نہ تھا کہ میں حق و صداقت کا دامن چھوڑ دوں۔ چنانچہ میں نے اپنے دل میں طے کر لیا کہ میں برسر اقتدار آ کر ثریا کو عدالت کے سپرد کر دوں گا۔

اوشا کی مدد سے میں نے وزارت مرتب کر لی۔ چند دن بعد ہماری شادی ہو گئی۔ شادی کے موقع پر شیریں کے عزیزوں میں سے اشرف اور ثریا کو میں نے نہ دیکھا اور نہ ان کی غیر حاضری کی وجہ دریافت کی۔

ہسپتال اوشا کے ماتحت تھے۔ ایک دن میں نے بطور وزیر اعظم کے اسے کہا کہ وہ ثریا کے خلاف قانون کو فی الفور حرکت میں لائے تاکہ انصاف کا حق ادا ہو۔ اوشا نے مسکرا کر نوٹ بک میں یہ بات لکھ لی اور وعدہ کیا کہ وہ جلد از جلد ضروری کارروائی کرے گی۔ اور ثریا کا کیس پولیس کے سپرد کر دیا جائے گا۔

اسی شام مجھے ایک زنانہ ہسپتال کا معائنہ کرنا تھا۔ انسپکٹر

جنرل شفاخانہ جات نے اس محکمہ کی انچارج وزیر ادشا کے توسط سے درخواست کی تھی کہ میں اس زنانہ ہسپتال کا معائنہ کروں۔ مجھے بتایا گیا کہ اس ہسپتال میں عورتوں کی آنکھوں کا آپریشن کیا جاتا ہے ایک بڑی قابل لیڈی ڈاکٹر آپریشن کرتی ہے۔ اس کے آپریشن سو فیصدی کامیاب ہوتے ہیں اور ہر روز ڈیڑھ دو سو آپریشن ہو جاتا ہے۔ دوسرے صوبوں کے مریض بھی علاج کے لئے جوق در جوق آرہے ہیں۔ میں انسپکٹر جنرل شفا خانہ جات کے دفتر اور ایک زنانہ ہسپتال میں بحیثیت کلرک کے کام کر چکا تھا۔ اس وجہ سے بھی مجھے اس محکمہ سے دلچسپی تھی۔ میں نے زنانہ ہسپتال کا معائنہ کرنا منظور کر لیا معائنہ کے وقت ادشا اور شیریں میرے ہمراہ تھیں انسپکٹر جنرل بھی موجود تھا۔ اس نے لیڈی ڈاکٹر سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ ہیں لیڈی ڈاکٹر ثریا جن کی محنت اور قابلیت کی بدولت ہزارہا نابیناؤں اور نیم نابیناؤں کو دوبارہ آنکھیں نصیب ہو چکی ہیں"۔

ثریا نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ مگر آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کے کارنامہ پر اظہار پسندیدگی کیا۔ اور اس کامیابی پر مبارکباد دی۔

شیریں دوسری طرف منہ کئے مسکرا رہی تھی۔ ادشا نے میرے

کان میں کہا

"بچاری ثریا! لاش بن سکتا اس کی قسمت میں نہ تھا ناچار زندہ ہے زندگی نے اس کی قدر و منزلت کتنی کم کر دی ہے بچاری زندہ ہو کر بھی اس وقت لاشوں سے مرعوب ہے"۔ پھر اوستانے اونچی آواز سے کہا ۔

"قانون یہ کہتا ہے کہ قاتل کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دو آپ کا قاتل ہزاروں اندھوں کو آنکھیں بخش رہا ہے مکے لئے اب کیا ارشاد ہے؟ قانون کا منشا پورا کیجئے تو ساتھ ہی یہ ہسپتال بھی بند ہو جائیگا ۔ قانون کو نظر انداز کر دگے تو بے انصافی ہو گی"۔

میں نے جواب دیا

"ہم اپنے ہی بنائے ہوئے قانون کا منشا پورا کرنے کے لئے پیدا نہیں ہوئے ۔ بلکہ ہم نے قانون اپنی سہولت اور انصاف کیلئے بنایا ہے۔ اصل مقصد انصاف ہے اور انصاف میں بات کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہو سکتا ثریا پر مقدمہ چلایا جانا ضروری ہے ۔ البتہ ہم عدالت کو توجہ دلائینگے کہ ثریا کی خدمت خلق کو پوری طرح مدِ نظر رکھا جائے اور انصاف محض انصاف کی خاطر کیا جائے نہ کہ قانون کا منشا پورے کرنے کیلئے؟"

چند دن میں ثریا کے مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا ۔ ثریا نے اقبال جرم کر لیا عدالت نے نرس کے خاوند کو بھی طلب کیا تھا ۔ اس نے عدالت سے کہہ دیا کہ ثریا اس کی آنکھوں کا آپریشن کر کے اس کی زائل شدہ بینائی واپس دے چکی ہے اس لئے وہ ثریا سے انتقام لینا نہیں چاہتا ۔

عدالت نے تمام حالات کو مدِنظر رکھ کر ثریا کو پانچ ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا دی ۔ جرمانہ وصول کر کے نرس کے خاوند کو بطور خون بہا کے دیدیا گیا ۔

مجھے شیریں کی زبانی معلوم ہوا کہ اشرف جو سمندر پار بھاگ گیا تھا وہ ابھی تک واپس نہیں آیا ۔ ثریا کا نصب العین خدمتِ خلق ہے خدا نے اس کے ہاتھ میں غیر معمولی تاثیر دی ہے ۔ وہ خوش ہے کہ وہ اپنے نصب العین میں کامیاب ہے ۔

تعلیمی پریس لاہور میں باہتمام خواجہ محمد عبداللہ پرنٹر چھپوا کر ایم ظہیر منیجر کتاب خانہ پنجاب لاہور نے بیرون لوہاری دروازہ سے شائع کیا

معذرت

اس میں شک نہیں کہ زیر نظر کتاب کی کتابت وطباعت قطعاً ہمارے معیار کے مطابق نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتاب ایک اور ادارے کے زیر اہتمام شائع ہو رہی تھی لیکن چند مجبوریوں کی بنا پر وہاں شائع نہ ہو سکی اور فوری ضرورت کے پیش نظر ہمیں من وعن شائع کرنی پڑی۔ یہ صورت حالات ہمارے ذوق پر بھی گراں ہے لیکن مندرجہ بالا مجبوریوں کی بنا پر ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

انشاء اللہ اگر آئندہ اشاعت کی ضرورت پیش آئی تو ہم اپنی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے موجودہ تمام شکایات رفع کرنے کی پوری پوری کوشش کرینگے۔

(منیجر کتاب خانہ پنجاب لاہور)